JADD-O-JEHAD-E -AZADI AUR MAULANA ASHRAF ALI THANVI by PROF. AHMED SAYEED. 170 Pages. Rs. 5.50.

THIS book on an uncommon subject should be welcome as an authentic account of the role of the ulema in politics. Ashraf Ali Thanvi was not an ordinary a'lim and holds an illustrious place among Islamic scholars, but his contribution to Muslim politics is very little known. The author draws upon authentic documents for his narrative so that we have a sufficiently accurate account of Maulana Thanvi's politics. Unfortunately, however, the author has not dealt with his subject in a critical manner but as a devotee.

Ashraf Ali Thanvi held strong views on the Hindu Muslim question. He thought very highly of Sir Syed's objectives but depreciated his via media. And he frowned on Gandhiji and on the Hindu desire to exterminate Muslims, which he described as their natural sport ("dili mazaq"); and, according to the author, he not only advocated the Sub-Continent's partition as early as 1928, but also, on the advice of several "mujzoobs" even prophesied it in 1938. Thus believers of the two-nation theory will find in Ashraf Ali Thanvi a great champion of their [illegible]

☆مولانا اشرف علی تھانوی اور تحریک آزادی

از: پروفیسر احمد سعید

پیشکش: طوبیٰ لائبریری راولپنڈی

معاونِ خصوصی: طاہر صدیقی

special thanks to

KHALID TANVEER

مولانا اشرف علی تھانوی

اور

تحریک آزادی

پروفیسر احمد سعید

سلسلہ اشاعت تحریک آزادیٔ پاکستان نمبر ۲

نام کتاب: مولانا اشرف علی تھانوی اور تحریک آزادی

مصنف: پروفیسر احمد سعید ایم اے (تاریخ) ایم اے (سیاسیات)

ناشر: مجلس صیانۃ المسلمین، لاہور

باہتمام: وکیل احمد شیروانی (ناظم نشر و اشاعت) مجلس ہذا

کتابت: محمد الیاس نقشبندی (کاتب امروز)

سرورق: عبدالرشید قمر

تاریخ اشاعت: ۱۹۸۳ء

پریس: نفیس پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت: 30/-

کتاب ملنے کے پتے

دفتر مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان، جامعہ اشرفیہ فیروزپور روڈ لاہور

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

ادارہ تالیفات اشرفیہ ریلوے روڈ ملتان

دارالاشاعت اردو بازار کراچی نمبر ۱

کتب خانہ مظہری، گلشن اقبال نمبر ۲ کراچی

مکتبہ فیض اشرف - ۸۷ اے ماڈل ٹاؤن لاہور

مُصنّف

پروفیسر احمد سعید —— نومبر ۱۹۴۱ء میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی سے تاریخ (۱۹۶۵) اور سیاسیات (۱۹۶۶ء) میں ایم اے کیا۔ آپ ۱۹۶۶ء سے ایم اے او کالج لاہور کے شعبۂ تاریخ سے منسلک ہیں۔ آپ کو قائد اعظم انٹرنیشنل کانگرس (دسمبر ۱۹۷۶ء اسلام آباد) اور علامہ اقبال انٹرنیشنل کانگرس (لاہور ۱۹۷۷ء) میں بحیثیت پاکستانی مندوب شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔ آپ کے تحقیقی مضامین ملک کے اہم جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کی مندرجہ ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں۔

۱- مولانا اشرف علی تھانوی اور تحریک آزادی ... خالد ندیم پبلی کیشنز راولپنڈی ۱۹۷۲ء
۲- حصول پاکستان . . . . ایجوکیشنل ایمپوریم لاہور ۱۹۷۲ء
۳- ذکر مجذوب . . . . احیاء العلوم الشرقیہ لاہور ۱۹۷۳ء
۴- بزم اشرف کے چراغ . . . . ایجوکیشنل ایمپوریم لاہور ۱۹۷۵ء
۵- قائد اعظم اور مسلم پریس . . . . ایجوکیشنل ایمپوریم لاہور ۱۹۷۶ء
۶- گفتار قائد اعظم . . . . قومی کمیشن تحقیق تاریخ و ثقافت اسلام آباد ۱۹۷۶ء
۷- اشاریہ قائد اعظم . . . . نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد ۱۹۷۶ء
۸- Writings of the Quaid-i-Azam ایجوکیشنل ایمپوریم لاہور ۱۹۷۶ء

۹۔ اقبال اور قائداعظم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اقبال اکیڈمی لاہور ۱۹۷۷ء

۱۰۔ حیات قائداعظم چند نئے پہلو ۔ ۔ ۔ قومی کمیشن تحقیق تاریخ و ثقافت اسلام آباد ۱۹۷۷ء

۱۱۔ قائداعظم مسلم پریس کی نظر میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قائداعظم اکیڈمی کراچی ۱۹۸۱ء

۱۲۔ تاریخ پاکستان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایجوکیشنل ایمپوریم لاہور ۱۹۸۱ء

۱۳۔ تحریک پاکستان کا معاشی اور معاشرتی پس منظر ۔ ۔ ۔ زیر طبع

۱۴۔ The Eastern Times on Quaid-i-Azam

۱۵۔ انجمن اسلامیہ امرتسر تعلیمی و سیاسی خدمات ۔ ۔ ۔ ۔ زیر قلم

۱۶۔ Modern Muslim India 1857-1947
A Biographical Dictionary [in progress] زیر قلم

فہرست

۴۔ باب سوئم

۵۔ باب چہارم

حرفِ اوّل

اللہ تعالیٰ کا بے حد کرم و احسان ہے کہ اس نے میری کتاب مولانا اشرف علی تھانوی اور تحریکِ آزادی کو مقبولیت اور اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کی توفیق بخشی۔ پہلے ایڈیشن میں مختلف وجوہ کی بنا پر نہ صرف کتاب کے متن بلکہ حوالہ جات میں بھی بیشمار اغلاط رہ گئی تھیں۔ بعض مقامات پر تو مفہوم ہی بدل گیا تھا۔ اسی دوران مجھے بہت سا نیا مواد بھی میسر آیا جس کے سبب کتاب پہلے کی نسبت دوگنا ضخیم ہوگئی ہے۔ اس مرتبہ تمام حوالہ جات کو دوبارہ چیک کیا گیا ہے۔ حوالہ جات کے ضمن میں ایک بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ جس جگہ بھی کسی کتاب کا پہلی مرتبہ ذکر کیا گیا ہے وہاں اس کے مکمل کوائف پیش کیے گئے ہیں لیکن بعد میں صرف اِس کتاب کا نام ہی درج ہے۔

پنجاب پبلک لائبریری کے مناظر عالم نے کتاب کا اشاریہ تیار کرنے اور کتابیں فراہم کرنے کا کام حسب سابق نہایت ذوق و شوق سے انجام دیا جس کے لیے میں ان کا بے حد ممنون ہوں۔ مولانا وکیل احمد شروانی صاحب ناظم نشر و اشاعت مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان کا بالخصوص ممنون ہوں جنہوں نے مجلس صیانۃ المسلمین کی طرف سے کتاب کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

احمد سعید

۲۶/اکتوبر ۱۹۸۱ء

گرامی نامہ حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی
بنام قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم

مکرم محترم دام لطفہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الطاف نامہ نے مسرور و ممنون
اور عنایت [illegible] مطمئن فرمایا۔ دل سے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دین اسلام
کی قوت کا ذریعہ بنادے۔ میں بکثرت دعا میں مشغول رہتا ہوں۔ الحمد للہ
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] والسلام

اشرف علی عفی عنہ
از تھانہ بھون
۱۱ ربیع الثانی

جاری کردہ۔ مجلس صیانۃ المسلمین پاکستان۔ لاہور

حاصل کردہ از نیشنل آرکائیوز آف پاکستان، اسلام آباد

تحریک پاکستان اور علمائے دیوبند

چند کتابوں کا سرسری جائزہ

تحریک پاکستان اور علمائے دیوبند کے موضوع پر کافی کچھ لکھا جا چکا ہے مگر یہ امر قابل افسوس ہے کہ اب تک جو کچھ بھی منصۂ شہود پر آیا اس میں تصویر کا محض ایک ہی رخ پیش کیا گیا ہے۔ اس صورت حال نے ایک عام فرد کے ذہن پر یہ بات نقش کر دی ہے کہ اول تو سرے سے علماء کا تحریک پاکستان سے کوئی تعلق ہی نہیں اور اگر ہے تو محض اتنا کہ انہوں نے تحریک و قیام پاکستان کی مخالفت کی اور بس۔ اس موضوع پر شائع شدہ کتب میں یہی تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ مدرسہ دیوبند مجموعی طور پر اول تا آخر پاکستان کی مخالفت میں سرگرم رہا ہے۔ اس سلسلے میں ضیاء الحسن فاروقی کی کتاب The Deoband School and the Demand for Pakistan. خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ ضیاء الحسن فاروقی کی مندرجہ بالا کتاب ۱۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں صرف دو صفحات ۱۰۳-۱۱۹ پر مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کا محض چار سطروں میں ذکر کیا گیا ہے۔ چوہدری حبیب احمد کی کتاب تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء (صفحات ۱۰۳۹) پڑھنے کے بعد اس خیال کو مزید تقویت ملتی ہے کہ علماء دیوبند کی اکثریت تحریک پاکستان کے خلاف تھی۔ ڈاکٹر پیٹر ہارڈی نے اپنی کتاب Partners in Freedom and True Muslims. میں تحریک آزادی میں حصہ لینے والے ان مسلمان علماء کے سیاسی افکار کا جائزہ لیا ہے جنہوں نے

ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندوؤں کے ساتھ تعاون کیا۔ کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کے سیاسی رجحانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب میں مولانا شبیر احمد عثمانی کا تذکرہ چند سطروں میں کیا گیا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی کتاب Ulema in Politics. شائع ہوئی۔ ۴۳۲ صفحات کی اس ضخیم اور تحقیقی کتاب میں علماء کے سیاست میں عمل دخل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب میں جہاں مولانا مودودی سے لے کر مولانا حسین احمد مدنی، مولانا آزاد اور مولانا سندھی اور دیگر علماء کے کارناموں کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے وہاں مولانا اشرف علی تھانوی کے سیاسی رجحانات اور خدمات کو محض ۲۳ سطروں پر مشتمل ایک پیراگراف میں سمو دیا گیا ہے۔ مولانا محمد شفیع مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا ظفر احمد تھانوی کو دو صفحات سے زائد جگہ نہیں مل سکی۔

ڈاکٹر وحید الزمان کی کتاب Towards Pakistan میں مسلمانوں کے سیاسی افکار پر بحث کی گئی ہے۔ ۲۵ صفحات پر مشتمل ایک علیحدہ باب میں مولانا ابوالکلام آزاد، جمعیۃ العلماء ہند، مجلس احرار وغیرہ کا تذکرہ تو ملتا ہے لیکن مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے سیاسی افکار و خدمات پر بحث غیر ضروری سمجھی گئی۔

ڈاکٹر کے کے عزیز نے اپنی کتاب The Making of Pakistan جو کہ لندن سے شائع ہوئی تھی کے ایک باب میں نیشنلسٹ مسلمان کے زیر عنوان مولانا آزاد اور جمعیۃ العلماء ہند کی سیاسی سرگرمیوں پر بحث کی ہے۔ اس باب میں سات سطروں میں مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کا ذکر کیا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے جمعیۃ العلماء اسلام کی تشکیل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ۱۹۴۶ء میں جمعیۃ العلماء میں پاکستان کے مسئلہ پر پھوٹ پڑ گئی اور ایک گروپ نے علیحدگی اختیار کر کے جمعیۃ العلماء اسلام کے نام سے ایک علیحدہ تنظیم قائم کر لی۔ مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کو جماعت کے دو راہنما بتلایا گیا جبکہ مولانا تھانوی ۲۱ جولائی ۱۹۴۳ء کو وفات پا چکے تھے

اور جمعیۃ العلماء اسلام کی تشکیل ۱۹۴۶ء کی بجائے اکتوبر ۱۹۴۵ء کو عمل میں آئی تھی۔

ڈاکٹر سمتھ جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی فکری، سیاسی اور قومی تحریکوں پر ایک مبسوط کتاب Modern Islam in India تحریر کی ہے، ایک مقالہ The Ulema in Indian Politics لکھا اپنے موضوع پر ایک مختصر جائزہ ہے۔ مصنف نے ایک ایسے موضوع پر جو ایک طویل عہد پر پھیلا ہوا ہے مختصراً سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اس نے ہندوستان کی مسلم سیاست میں علمائے دیوبند کے رویے اور رجحان سے تو بحث کی ہے لیکن تحریک آزادی اور تحریک پاکستان کے تعلق پر روشنی نہیں ڈالی اور نہ کسی عالم کا ذکر کیا۔ انفرادی طور پر محض مولانا ابوالکلام آزاد کو موضوع بنایا ہے۔

۱۹۶۹ء میں ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے تحریک پاکستان کے موضوع پر ایک نہایت وقیع کتاب ہماری قومی جدوجہد تحریر کی۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن، علامہ اقبال کے قریبی ساتھی، مشہور ادیب اور افسانہ نویس ہیں۔ اپنی اس کتاب میں ڈاکٹر بٹالوی نے علماء دیوبند سے متعلق چند ایک باتیں ایسی لکھ دیں جن کا تعلق انشاء پردازی اور افسانہ نویسی سے تو ہو سکتا ہے مگر تاریخ نویسی سے ہرگز نہیں۔ ڈاکٹر بٹالوی کی ان افسانوی باتوں کا جائزہ لینا اس لیے ضروری ہو گیا ہے کہ ایک عام صورت میں علماء بالخصوص علماء دیوبند کے خلاف ایک منظم تحریک کے ذریعے ذہنوں کو پہلے ہی زہر آلود کر دیا گیا ہے۔ یہ تاثر عام پھیلا دیا گیا ہے کہ علماء دیوبند کی اکثریت تحریک و قیام پاکستان کے خلاف تھی۔ حالانکہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے ضمن میں علمائے دیوبند واضح طور پر دو مختلف اور متضاد نظریاتی گروہوں میں منقسم تھے۔ اگر ایک طرف مولانا حسین احمد مدنی کی زیر قیادت ایک گروپ کانگرس کی حمایت میں متحدہ ہندوستان کے لیے سرگرم عمل تھا تو دوسری جانب مولانا اشرف علی

تھانوی کی رہنمائی میں علماء کا ایک دوسرا بااثر اور مضبوط گروہ تحریک پاکستان کی خاطر اپنی تحریری،
تقریری اور علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہا تھا۔ یہاں اس امر کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ برعظیم
پاک و ہند میں مولانا اشرف علی تھانوی کا حلقہ مریدین ہزاروں سے نکل کر لاکھوں تک پھیلا ہوا
تھا اور یہ بات خارج از امکان ہے کہ کوئی مرید اپنے مرشد کی ہدایات اور رجحانات کے برعکس
کوئی اور نظریات رکھے یا ان پر عمل کرے اور یہ کہ جب تک مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے
اس رجحان کو ظاہر نہیں کیا تھا، برابر اور مسلسل ان کے مریدین و مسترشدین و وابستگان کی طرف
سے استفساری خطوط بکثرت آ رہے تھے کہ وہ کدھر قدم بڑھائیں؟ پھر مولانا کی طرف سے
مسلم لیگ کی حمایت میں ان کی رائے کی اشاعت کے بعد ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں
ایسے مسلمان جو غیر جانبداری اور تذبذب کی حالت میں تھے، پوری قوت کے ساتھ مسلم لیگ
کا ساتھ دینے لگے اور علامہ شبیر احمد عثمانی (جو عرصہ سے سیاست سے یکسو ہو کر گوشہ گمنامی میں
زندگی گزار رہے تھے)، مولانا ظفر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا اطہر علی وغیرہم علماء
کی ایک عظیم جماعت میدان میں آئی اور دیکھتے دیکھتے مسلم لیگ کی کایا پلٹ گئی۔ دراصل
مسلم لیگ کو تقویت اور مقبولیت عامہ ان ہی علماء کی تائید اور حمایت سے حاصل ہوئی۔ ورنہ
عام مسلمان، مسلم لیگ کو انگریزوں کی حاشیہ بردار سمجھ کر اس میں شرکت سے گریز کرتے تھے۔
یہی علماء تھے جنھوں نے قریہ قریہ، کوچہ کوچہ جا کر اس طلسم کو توڑا اور عوام الناس کی ڈھارس

بندھائی اور ان کو مسلم لیگ میں شرکت پر آمادہ کیا۔ ان حقائق کو چھپانا، اور ان سے روگردانی
یا ان کو جھٹلانا، آفتاب پر خاک ڈالنے اور صداقت کا منہ چڑانے کے مترادف ہے جو کبھی
کامیاب نہیں ہو سکتی۔

ایک تاریخ نویس کے لیے ضروری ہے کہ وہ غیر جانبدار ہو، اس کی تحریروں میں اس کے
جذبات کو بالکل دخل نہ ہو، جو بات کہے حوالہ جات کے ساتھ بیان کرے، افسانہ نویسی سے
احتراز کرے۔ خود ڈاکٹر بٹالوی نے اپنی مندرجہ بالا کتاب میں تاریخ نویسی کے ان بنیادی
اصولوں کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "تاریخ نویسی کا مسلمہ اصول یہ ہے کہ واقعات کے
بیان کرنے میں پوری دیانت برتی جائے۔ البتہ واقعات کی تاویل و توجیہات اور تعبیر اور
ان سے نتائج اخذ کرنے کا حق ہر شخص کو حاصل ہے۔"(۱) لیکن یہ امر نہایت ہی افسوسناک ہے
کہ ڈاکٹر بٹالوی نے اپنے ہی بیان کردہ تاریخ نویسی کے اصولوں کو خود ہی مجروح و پامال کیا۔
ڈاکٹر بٹالوی لکھتے ہیں "کوئی مانے نہ مانے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جناح مسلمانوں کا پہلا سیکولر
Secular لیڈر تھا جس نے ہماری سیاست کو پیشہ ور مولویوں سے نجات دلائی۔ سر سید
مرحوم بھی سیکولر لیڈر تھے لیکن مولویوں نے ان پر کفر کا فتویٰ لگا کر انہیں واجب القتل قرار دیا تو
اس غریب کو بھی جان بچانے کے لیے اور مولویوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے ان ہی کے
ہتھیار استعمال کرنے پڑے۔"(۲) اپنی اس تحریر میں ڈاکٹر بٹالوی نے دو غیر مستند غیر تاریخی باتیں بیان
کیں۔ پہلی یہ کہ جناح مسلمانوں کا سیکولر لیڈر تھا۔ سیکولر سے اگر ڈاکٹر بٹالوی کی مراد یہ ہے کہ قائد اعظم
سیاست اور مذہب میں تفریق کے حامی تھے تو یہ بات تاریخی طور پر غیر مستند ہے۔ قائد اعظم

(۱) عاشق حسین بٹالوی ہماری قومی جدوجہد (البیان لاہور ۱۹۶۹) ص ۱۲

(۲) ہماری قومی جدوجہد (۱۹۳۸) ص ۷۱ - ۷۲

کی تقاریر کو پڑھیے صورتِ حال کی وضاحت ہو جائے گی۔ مسٹر جناح نے علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "مجھے بحیثیت مسلمان دوسری اقوام کے معاشرت اور تہذیب کا پورا احترام ہے لیکن مجھے اپنے اسلامی کلچر اور تہذیب سے بہت زیادہ محبت ہے میں ہرگز نہیں چاہتا کہ ہماری آنے والی نسلیں اسلامی تہذیب، تمدن اور فلسفے سے بے بہرہ ہوں"[1] جون ۱۹۴۸ء میں کراچی چیمبرز آف کامرس اینڈ میمن مرچنٹس ایسوسی ایشن کے سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے فرمایا "مسلمانوں کے لیے پروگرام تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے ان کے پاس تو ۱۳۰۰ برس سے ایک مکمل پروگرام موجود ہے اور وہ قرآن پاک ہے۔ میرا اسی قانون الٰہیہ پر ایمان ہے اور میں جو آزادی کا طالب ہوں وہ اسی کلام الٰہی کی تعمیل ہے"[2] ایک اور موقع پر انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا "میں نہ کوئی مولوی ہوں اور نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلام کا اپنے طور پر مطالعہ کیا ہے۔ اس عظیم الشان کتاب میں اسلامی زندگی سے متعلق ہدایات کے باب میں زندگی کا روحانی پہلو، معاشرت، سیاست، معیشت غرض انسانی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جو قرآن مجید کی تعلیمات کے احاطے سے باہر ہو۔ قرآن کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لیے بہترین ہیں بلکہ اسلامی سلطنت میں غیر مسلموں کے لیے بھی سلوک اور آئینی حقوق کا اس سے بہتر تصور ممکن نہیں"[3]

فروری ۱۹۴۸ء میں امریکی عوام کے نام ایک پیغام میں آپ نے فرمایا "پاکستان کا دستور ابھی آئین ساز اسمبلی نے تیار کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی شکل کیا ہو گی لیکن یہ ایک جمہوری آئین ہو گا جس میں اسلام کے بنیادی اصول شامل ہوں گے۔ یہ دستور زندگی میں آج بھی اسی طرح

---

(۱) احمد سعید گفتار قائد اعظم (قومی کمیشن برائے تحقیق تاریخ و ثقافت اسلام آباد ۱۹۷۶ء) ص ۱۰۶

(۲) گفتار قائد اعظم ص ۲۱۶ (۳) گفتار قائد اعظم ص ۲۶۱

قابل عمل ہیں جس طرح آج سے ۱۳۰۰ سال قبل قابل عمل تھے۔ اسلام نے ہمیں جمہوریت کا سبق دیا ہے"[1] ایک اور موقع پر فرمایا کہ "قرآن مجید صرف مذہبی اصولوں تک محدود نہیں بلکہ یہ زندگی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے"[2]

ڈاکٹر بٹالوی نے دوسری بات سرسید احمد خاں سے متعلق کہی ہے کہ مولویوں نے انہیں واجب القتل قرار دیا تاریخی حقائق کے بالکل خلاف ہے مشکل یہ ہے کہ موصوف نے کم علم مولویوں اور علماء میں کوئی تمیز روا نہ رکھی اور دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک دیا۔ سرسید کو جن مولویوں نے کافر قرار دیا وہ آجکل کے سرکاری وظیفہ خوار دانشوروں کی طرز کے مولوی تھے ورنہ برعظیم کے جید علما اور مشائخ کے متعلق یہ لکھنا کہ انہوں نے سرسید کے قتل کا فتویٰ دیا لاعلمی کے سوا کچھ نہیں۔ علماء اور مشائخ کی طرف سے قتل کا فتویٰ جاری ہوتا تو کجا انہوں نے سرسید کو کافر تک نہیں کہا تصوف کے میدان میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا مقام اہل علم سے مخفی نہیں۔ حضرت حاجی صاحب نے ایک مرتبہ سرسید کو بطور نصیحت ایک خط لکھنا چاہا اور اس کے لیے مسودات طلب فرمائے۔ بہت سے لوگوں نے مسودات تیار کیے لیکن حضرت حاجی صاحب کو مولانا اشرف علی تھانوی کا مسودہ بہت پسند آیا۔ آپ نے سرسید کے متعلق کیا رویہ اختیار کیا وہ اس خط سے واضح ہو جائے گا۔ "بخدمت جناب عالی مرتبت مجمع الاخلاق والطاف سلمہم اللہ تعالیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ ہر چند کہ مجھ کو آپ سے صوری نیاز حاصل نہیں مگر آپ کے اخلاق کے اوصاف سن کر غائبانہ تعلق ضرور ہے جس نے اس عرض کی جرأت دلائی ہے۔ آپ میری گمنامی اور ناشناسائی پر توجہ نہ فرمائیں بلکہ انظر ما قال ولا تنظر الی من قال کو پیش رکھیے۔ اب میں بنام خدا شروع کرتا ہوں۔ جناب

---

(1) Quaide Azam Mohammad Ali Jinnah Speeches As Governor General (Islamabad) p.67.

(2) Jamil ud Din Ahmad Speeches of Mr.Jinnah vol I (Sh.Mohammad Ashraf) p 405

تک آپ کی مساعی اور تصانیف کو غور سے دیکھا ہے تو معلوم ہوا ہے کہ آپ کو دو چیزیں مقصود ہیں۔ خیر خواہی اسلام اور خیر خواہی مسلمانان جس نے آپ کو اس امر پر مجبور کیا کہ جو اعتراضات مذہب اسلام پر مخالفین نے کئے ہیں ان کے جوابات دیے جائیں۔ خیر خواہی اسلام اس امر کا باعث ہوئی کہ مسلمان جو پستی میں گرے ہوئے ہیں ان کو ترقی پر پہنچایا جائے۔ ان دو باتوں کے مستحسن ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ مگر غور طلب بات یہ ہے کہ ان مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے ذرائع کیا استعمال کئے جا رہے ہیں۔"[1]

ہندوستان کے تمام جید علماء اور مشائخ نے سرسید کی مسلمانوں کے لیے ہمدردی اور خیر خواہی کی برملا تعریف کی۔ اگرچہ انہوں نے سرسید کے طریق کار سے اختلاف کیا مگر انہیں کبھی بھی کافر قرار نہیں دیا۔ جس وقت سرسید نے ایم اے او کالج علی گڑھ کی بنیاد رکھی تو انہوں نے ایک خاص معتمد کو بھیجا کہ وہ مولانا رشید احمد گنگوہی سے ملاقات کر کے انہیں یہ پیغام پہنچائے کہ "میں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کالج کی بنیاد ڈالی ہے دوسری قومیں ترقی کر کے بہت آگے نکل چکی ہیں۔ مسلمان پستی کی طرف جا رہے ہیں اگر آپ حضرات میرا ہاتھ بٹائیں تو میں بہت جلد کامیاب ہو جاؤں گا جو حقیقت میں مسلمانوں کی کامیابی ہوگی۔" وہ سفیر گنگوہ گئے اور سرسید کا پیغام پہنچایا۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نے پیغام سن کر فرمایا کہ "بھائی ہم تو آج تک مسلمانوں کی فلاح کا راستہ اللہ اور اس کے رسول کے اتباع میں سمجھتے رہے مگر آج یہ معلوم ہوا کہ ان کی ترقی اور فلاح کا کوئی اور راستہ بھی ہے۔ تو اس کے متعلق میری عرض یہ ہے کہ میری تو ساری عمر قال اللہ وقال الرسول میں گذری ہے۔ مجھے ان چیزوں سے زیادہ مناسبت نہیں ہے۔" پھر آپ نے مولانا محمد قاسم نانوتوی کا

(۱) منشی عبدالرحمن خان "حیات اشرف" ملتان (ص ۸۳)

نام لیا اور فرمایا کہ "وہ ان باتوں میں مبصر ہیں۔ ان سے ملو جو وہ فرمائیں گے ہم ان کی تقلید کریں گے۔" جب یہ سفیر مولانا نانوتوی کے پاس پہنچے اور مولانا گنگوہی کا جواب ارشاد فرمایا تو مولانا نے کہا کہ "بات یہ ہے کہ کام کرنے والوں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک نیت اچھی مگر عقل اچھی نہیں دوسرے عقل اچھی مگر نیت اچھی نہیں تیسرے نہ عقل اچھی نہ نیت اچھی۔ سرسید کے متعلق یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ نیت اچھی نہیں ہے مگر یہ ضرور کہیں گے کہ عقل اچھی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ جس زینے سے مسلمانوں کو ترقی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں اور فلاح و بہبود کا سبب سمجھتے ہیں یہی مسلمانوں کے تنزل کا سبب ہوگا۔"[1]

سرسید کی زندگی ہی میں ان کی مذہبی تحریروں نے جو شکوک و شبہات پیدا کئے ان کا اندازہ ایک واقعے سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ خود ان کے دست راست نواب محسن الملک نے جب توریت اور انجیل کی تفسیر "تبیین الکلام" دیکھی تو انہیں اس کی عبارت اتنی شاق گذری کہ سرسید سے تعارف نہ ہونے کے باوجود ان کو خط لکھا اور جب تک ان سے نہ ملے تھے نواب صاحب کو یقین نہ آتا تھا کہ سرسید قبلہ رو ہو کر نماز پڑھتے ہیں۔[2] پھر ان کی مذہبی تحریروں اور کچھ دیگر وجوہ کی بنا پر ان کی زندگی ہی میں کفر کے فتوے جاری کئے گئے مگر یہ کام علماء اور مشائخ نے نہیں کیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی دارالعلوم دیوبند کے بانی، تقویٰ و طہارت میں بے مثال شخصیت تھے۔ ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے سرسید سے متعلق ایک فتویٰ آپ کو دستخطوں کے لیے پیش کیا۔ مولانا نے ان لوگوں سے کہا کہ بھائی میں پہلے تحقیقات کر لوں آیا وہ کافر ہیں بھی یا نہیں چنانچہ تحقیقات کی غرض سے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے سرسید کو

(۱) مولانا اشرف علی تھانوی "الافاضات الیومیہ" جلد چہارم تھانہ بھون ص ۳۰۴

(۲) محمد امین زبیری "حیات محسن" مسلم یونیورسٹی پریس علیگڑھ ۱۹۳۴ء ص ۱۲-۱۳

تین سوالات لکھ کر بھیجے (۱) خدا پر آپ کا عقیدہ کیا ہے؟ (۲) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کا عقیدہ کیا ہے؟ (۳) قیامت کے متعلق آپ کا عقیدہ کیا ہے؟۔

سرسید احمد خاں نے ان سوالات کے جواب میں لکھا (خدا تعالیٰ مالک ازلی اور صانع تمام کائنات ہے (۲) بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر (۳) قیامت برحق ہے۔

جب سرسید کا یہ جواب مولانا قاسم نانوتوی کے پاس پہنچا تو آپ نے ان لوگوں سے جو فتویٰ پر دستخط کرانے آئے تھے فرمایا "تم اس شخص کے خلاف دستخط کروانا چاہتے ہو جو پکا مسلمان ہے"[1]

مولانا اشرف علی تھانوی کا شمار برعظیم کے نامور جید علماء اور صوفیاء میں ہوتا ہے۔ آپ کے ملفوظات میں بے شمار جگہوں پر سرسید کا تذکرہ ملتا ہے۔ اگرچہ مولانا تھانوی بھی دیگر اکابر کی طرح سرسید کے طریق کار سے متفق نہ تھے۔ آپ سرسید کے کالج کو فالج کہتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ مغربی تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کی فلاح و بہبود ممکن نہیں لیکن اس اختلاف کے باوجود مولانا تھانوی نے کبھی بھی سرسید پر نہ تو ذاتی حملے کیے اور نہ ہی ان کو کافر بتلا کر واجب القتل قرار دیا۔ اس کے برعکس آپ نے سرسید کی مختلف صفات کی ہمیشہ برملا تعریف کی۔ آپ سرسید کے خلوص اور دلی ہمدردی کی اکثر تعریف کیا کرتے تھے۔ ایک مجلس میں دوران گفتگو فرمایا "عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو۔ سرسید کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی بہت ہی دھن تھی۔ اور اس معاملے میں بہت دل سوزی تھی۔ کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی اس صفت پر رحم فرمائیں"۔ سرسید کے عقیدہ توحید و رسالت کے بارے میں فرمایا "سرسید کا عقیدہ توحید اور رسالت کے متعلق جس درجہ کا بھی تھا پلا وسوسہ

(۱) عبید اللہ قدسی، "مقالات یوم شبلی" اردو مرکز لاہور ۱۹۹۱ء ص ۶۹-۶۸

اور نہایت پختہ تھا جیسا کہ ان کی بعض تصانیف سے مجھ کو ظاہر ہوا۔ اور قرآن و حدیث کی جو توجیہات انہوں نے کیں ان کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین کا اسلام پر کوئی اعتراض وارد نہ ہو گو اس کے لیے انہوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ غلط تھا۔ اس لیے میں ان کو نادان دوست کہتا ہوں"[1] ایک اور موقع پر مولانا تھانوی نے سرسید کے استغنا اور حوصلہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا "بڑا شخص جا ہے دین دار ہو یا دنیا دار اس میں استغنا ضرور ہوتا ہے۔ علی گڑھ کے سٹیشن پر سرسید ریل میں سوار ہوئے۔ اس ڈبہ میں پہلے سے ایک اور شخص سوار تھے۔ انہوں نے سرسید سے پوچھا کہ یہ کونسا شہر ہے۔ انہوں نے کہا علی گڑھ جواب سن کر وہ صاحب بولے کہ وہی علی گڑھ جس میں سرسید (ایسا ویسا) رہتا ہے۔ سرسید نے کہا کہ جی ہاں وہی علی گڑھ۔ اس پر ان صاحب نے سرسید کو اور برا بھلا کہا۔ سرسید نے کہا جی ہاں ایسا ہی ہے۔ یہ صاحب اور کھلے اور کئی اسٹیشن تک تبرّی کرتے چلے گئے۔ سرسید کو ذرا بھی تغیر نہ ہوا۔ ایک سٹیشن پر تبرّی کرنے والے شخص نے کھانا نکالا اور سرسید کو دعوت دی۔ سرسید نے انکار کیا۔ انہوں نے عذر پوچھا سرسید نے کہا مجھ کو واقعی عذر ہے۔ انہوں نے عذر پوچھا سرسید نے کہا اگر میں اس وقت بتلاؤں تو اس وقت تو آپ کھانے پر بیٹھے ہیں اور معلوم ہو جائے تو شاید میری صورت دیکھنا گوارا نہ کریں۔ انھوں نے کہا یہ کونسی بات ہے۔ سرسید نے تب کہا میں ہی وہ سرسید ہوں۔ یہ سن کر وہ صاحب بہت شرمندہ ہوئے باوجودیکہ سرسید دنیا دار شخص تھے مگر استغنا اور حوصلہ تھا"[2] مولانا تھانوی نے سرسید کے تحمل کے متعلق ایک اور واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "کسی نے سرسید کی ہجو میں نظم

(۱) خواجہ عزیز الحسن مجذوب "اشرف السوانح" جلد اول (ایم ثناء اللہ اینڈ سنز لاہور) ص ۲۱۵

(۲) الافاضات الیومیہ جلد اول ص ۲۶

لکھی۔ اور اس کو کالج کے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر پڑھا۔ سر سید احمد نے مکان سے نکل کر کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ میری قوم یاد کرتی ہے اور پچیس روپے ان صاحب کو دے دیئے۔ وہ صاحب بھی کمال کرتے ہیں وہ روپے لے لیے۔ اس سے سر سید کا بہت ہی متحمل ہونا ثابت ہے۔"(۱)

مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی اپنے زمانے کے مشہور اکابر صوفیاء میں شمار ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ کوئی مولوی صاحب سر سید کے بارے میں تذکرہ کر رہے تھے کہ اس نے شریعت محمدی میں بڑا تنزل اور اختلاف پیدا کیا ہے۔ ہزاروں حملے شریعت پہ کئے ہیں۔ مولانا فضل الرحمن نے یہ باتیں سن کر کہا کہ "ان کی ظاہری تقریر کو نہ دیکھو ان کے قلب کو دیکھو کیسا ہے۔"(۲) مولانا محمد علی مونگیری خلیفہ مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی نے بھی ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ "ایک مرتبہ حضرت قبلہ حجرہ میں بیٹھے تھے کہ چند مولوی صاحبان صحن میں لڑ رہے تھے کہ سر سید روایات صحیحہ کا انکار کرتا ہے" "تواتر کا انکار کرتا ہے" "کافر ہے۔ حضرت قبلہ حجرہ سے نکلے مسجد میں تشریف لائے اور مولانا مونگیری سے فرمایا "یہ لوگ اس بے چارے کو کافر بناتے ہیں مگر اس کے قلب کو دیکھو کیسا ہے۔"(۳)

یہ تھی سر سید کے متعلق چند علماء کرام اور مشائخ کی رائے۔ اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ جو کہ سر سید کی مدرسہ دیوبند اور علماء دیوبند کے متعلق کیا رائے تھی۔ مولانا محمد رفیع الدین مہتمم مدرسہ دیوبند نے سر سید کو مدرسہ کی ۱۲۸۹ھ کی رپورٹ بھیجی۔ سر سید احمد خاں نے اپنے رسالہ "تہذیب الاخلاق"

---

(۱) محمد یوسف حسن العزیز، جلد دوم ص ۱۲۷

(۲) شاہ تجمل حسین بہاری، کمالات رحمانی ص ۳، بحوالہ صدق جدید ۵ مئی ۱۹۶۱ء ص ۲

(۳) ایضاً ص ۱۰۳

میں جو رپورٹ لکھا وہ نہایت غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ سر سید کے دل میں علماء کرام بالخصوص علماء دیوبند کے متعلق جو محبت عقیدت اور حسن ظن موجود تھا اس رپورٹ سے صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ سر سید نے لکھا "مولوی رفیع الدین صاحب نے اس مدرسے کی سالانہ رپورٹ ۱۲۸۹ھ ہمارے پاس بھیجی ہے جس کے دیکھنے سے ہم کو نہایت ہی رنج ہوتا ہے اور مسلمانوں کی حالت پر کس قدر افسوس ہوتا ہے اب ہم اس رپورٹ پر متعدد طرح سے نظر ڈالتے ہیں۔

اول بلحاظ مسلمانوں کے مذہبی جوش و خروش کے ہم سمجھتے تھے کہ جو مدرسہ ہم قائم کرنا چاہتے ہیں اور جس میں علوم انگریزی اور دیگر علوم دنیاوی بشمول علوم دینی پڑھائے جاویں گے اس پر جو پکے مسلمان یا متعصب، دیندار یا متقشف وہابی ہیں اعتراض کرتے ہیں اور اس کو کرشانی مدرسہ ٹھہراتے ہیں۔ اور اسی سبب سے لوگوں کو اس میں چندہ دینے سے منع کرتے ہیں تو عربی مدرسہ جس میں بجز مسلمانی کے اور کچھ نہیں جس میں وہی پرانے علوم پڑھائے جاتے ہیں جن کو مسلمان چاہتے ہیں بڑے بڑے مسلمانوں نے ضرور مدد کی ہوگی۔ مگر اس رپورٹ کے دیکھنے سے ہم کو نہایت مایوسی ہوئی۔ بڑے سے بڑا چندہ آٹھ روپے پانچ آنہ ماہواری ہے۔ اس کے بعد پانچ روپے ماہواری کا۔ اس کے بعد تین روپے اور یہ تمام قسم کے چندے غیر مکمل ہیں بعضوں پر دو دو برس اور بعض پر ایک برس کا باقی ہے۔ لیکن یہ کارروائی ہمارے لیے اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ جو لوگ اپنے تئیں مقدس پکا مسلمان اور متقی ظاہر کر کے مدرسۃ العلوم مسلمانان میں شریک نہ ہونے کی وجہ اپنی دینداری ظاہر کرتے ہیں صرف سخن ساختہ اور حیلہ ناشرع ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ ان لوگوں نے عربی مدرسہ دیوبند جس میں بجز مسلمانی کے اور کچھ نہیں کیوں مدد نہیں کی حقیقت میں مسلمانوں پر بڑا افسوس ہے کہ ایسے مدرسے جن

میں مولوی محمد قاسم جیسا فرشتہ سیرت شخص نگران ہے اور مولوی محمد یعقوب صاحب جیسا شخص مدرس ہے کچھ مدد کریں۔

تمام رپورٹ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدرسہ خود اپنے پر یا مسلمانوں کی ہمدردی پر قائم نہیں بلکہ صرف ایک شخص کی ذات پر اس کا مدار ہے۔ مولوی محمد قاسم درحقیقت نہایت بزرگ و نیک مادر زاد ولی ہیں۔ تمام ضلع سہارن پور اور میرٹھ و مظفر نگر ان کا معتقد ہے۔ دوسرا بڑا سبب مولوی محمد یعقوب صاحب کا ہے جو مدرس اول اس مدرسہ کے ہیں اور جنہوں نے ۳۵ روپے ماہواری مدرسہ سے لینا قبول کیا ہے اور قناعت و زہد سے اس قلیل میں بسر اوقات کرتے ہیں۔ اگر وہ نہ ہوں تو کیا کوئی دوسرا شخص اس قلیل مشاہرہ پر ان علوم کو پڑھانے کو ملے گا پس یہ مدرسہ صرف دو بزرگوں کی دعا پر قائم ہے۔"[1]

سرسید کی مدرسہ دیوبند سے دلچسپی کا ایک اور ثبوت یہ بھی ہے کہ جب مدرسہ دیوبند کا سنگ بنیاد رکھا جانے لگا تو سرسید نے ایک خصوصی ایلچی اس رسم میں شرکت کے لیے بھیجا۔ اتفاق سے گاڑی لیٹ ہوگئی۔ سرسید نے تار دیا کہ میرا آدمی دیوبند پہنچ رہا ہے اس کا انتظار کیا جائے۔ سرسید نے اس کے ہاتھ پچاس روپے چندہ بھی بھیجا تھا۔"[2]

مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ۱۵ اپریل سنہ ۱۸۸۰ء کو وفات پائی۔ سرسید نے ۲۴ اپریل سنہ ۱۸۸۰ء کو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں جو تعزیتی مضمون لکھا اس سے سرسید کی عالی ظرفی اور علماء کے متعلق ان کے نیک جذبات کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ سرسید نے لکھا "افسوس ہے کہ جناب ممدوح مولوی محمد قاسم نے ۱۵ اپریل سنہ ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں

(۱) "تہذیب الاخلاق جمادی الثانی ۱۲۹۰ھ مشمولہ مقالات سرسید مجلس ترقی ادب لاہور حصہ ہفتم ص ۲۷۸-۲۸۰

(۲) محمد سرور افادات و ملفوظات عبید اللہ سندھی سندھ ساگر اکادمی لاہور ۱۹۷۲ء ص ۳۹۲ -

دیوبند میں انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رویا اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا لیکن ایسے شخص کے لیے رونا جس کے بعد اس کا جانشین کوئی نظر نہ آئے تو نہایت رنج و غم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ دہلی کے علماء میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم و فضل اور تقویٰ و ورع میں مشہور و معروف تھے ویسے ہی نیک مزاجی، سادگی اور مسکینی میں بے مثل تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحق کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں۔ مگر مولوی محمد قاسم نے اپنی کمال نیکی، دینداری، تقویٰ، ورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دہلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کی مثل اور شخص بھی خدا نے دنیا میں پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں اور زیادہ۔ بہت لوگ زندہ ہیں جنہوں نے مولوی محمد قاسم کو نہایت کم عمری میں دلی میں تعلیم پاتے دیکھا۔ انہوں نے جناب مولوی مملوک علی سے تمام کتابیں پڑھی تھیں۔ ابتدا ہی سے آثار تقویٰ اور ورع اور نیک بختی و خدا پرستی ان کے اوضاع و اطوار سے نمایاں تھے۔ اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا۔

بالائے سرش ز ہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

زمانہ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت، عالی دماغی اور فہم و فراست میں مشہور و معروف تھے ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے۔ ان کو مولوی مظفر حسین کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا۔ اور حاجی امداد اللہ کے فیض صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت عالی درجہ کا دل بنا دیا تھا۔ خود بھی پابند شریعت و سنت تھے اور لوگوں کو بھی پابند شریعت و سنت کرنے میں از حد کوشش کرتے تھے۔ با ایں

عام مسلمانوں کی بھلائی کا ان کو خیال تھا۔ ان ہی کی کوششوں سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے نہایت مفید مدرسہ دیوبند قائم ہوا۔ مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے۔ اور بعضوں سے وہ بھی ناراض تھے۔ مگر جہاں تک ہماری سمجھ کا تعلق ہے ہم مولوی محمد قاسم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی کا ہو خواہ کسی سے خوشی کا کسی طرح ہوائے نفس یا ضد یا عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام افعال جس قدر تھے بلا شبہ للہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق سمجھتے تھے اس کی پیروی کرتے تھے ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے واسطے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا۔ کسی شخص کو اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں سمجھتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ برے کام کرتا ہے خدا کے واسطے برا جانتے تھے۔

مسئلہ الحب للہ اور البغض للہ خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں والی تھیں۔ ہم اپنے دل کے ساتھ ان سے محبت رکھتے تھے۔ اس زمانے میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے۔ ان کا پلہ اس زمانے میں شاید معلوماتی علم میں شاہ عبدالعزیز سے کچھ کم ہو باقی تمام باتوں میں بڑھ کر تھا۔ ایسے شخص کے وجود سے دنیا کا خالی ہو جانا ان تمام لوگوں کے لیے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہوتا ہے۔ افسوس کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے عملی طور پر کوئی کام کرے زبانی عقیدت اور ارادت بہت ظاہر کرتی ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے افسوس اور حسرت کے کہہ کر خاموش ہو جائیں یا چند آنسو بہا کر اور رومال سے پونچھ کر چہرہ صاف کریں۔ بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں۔ دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگار ہے سب

لوگوں کا فرض ہے کہ وہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ ہمیشہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعے سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جمارہے۔"(۱)

ایم اے او کالج کے قیام کے بعد جب وہاں دینیات کا شعبہ قائم کیا گیا تو اس کے لیے مولانا محمد قاسم نانوتوی کے داماد مولانا عبداللہ انصاری اس کے ناظم مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں دارالعلوم دیوبند کی بڑی مخالفت تھی اس لیے کوشش کی گئی کہ ان کو ناظم دینیات نہ بنایا جائے۔ سرسید نے ان باتوں کو سننے سے انکار کر دیا اور بڑے اہتمام و اصرار سے مولانا عبداللہ انصاری کو ایم اے او کالج علی گڑھ لے آئے۔ سرسید نے اس موقع پر مولانا انصاری کے بارے میں لکھا "وہ نواسے ہیں مولوی مملوک علی صاحب کے، داماد ہیں مولوی محمد قاسم صاحب کے اور ان سب سے مجھے ذاتی واقفیت ہے اور امید ہے کہ ان بزرگوں کی صحبت سے مولوی عبداللہ کی طبیعت بھی ایسی ہوگی کہ دینی کاموں کو بلحاظ دین اور بلحاظ اسلام انجام دیں"(۲) سرسید احمد خاں مولانا قاسم نانوتوی کا جس قدر احترام کرتے تھے اس کا اندازہ اس مکتوب سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے دوست محمد عارف کو لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے ایک جگہ لکھا۔ "اگر جناب مولوی قاسم صاحب تشریف لائیں تو میری سعادت ہے۔ میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا۔"(۳)

سرسید نے جس طرح مولانا عبداللہ کی قدردانی کی اس کا اندازہ مولانا شبلی نعمانی سے ان کی ایک مراسلت سے بھی ہوگا۔ مولانا شبلی نے ۲۰ جنوری ۱۸۹۶ء کو سرسید کو لکھا "قیام

(۱) مقالات سرسید (حصہ ہفتم) ص ۲۰۵ ـ ۲۰۸

(۲) افادات و ملفوظات عبیداللہ سندھی ص ۳۹۲

(۳) مشتاق حسین (مرتب) مکاتیب سرسید احمد خان (لاہور تاریخ ندارد) ص ۴۷۵

آداب: مولانا انصاری ماشاء اللہ جلیل القدر فاضل اور نہایت بابرکت شخص ہیں۔ اب
یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف کا ترجمہ جو خاکسار کالج کے طلباء کو پڑھاتا ہے وہ مولانا
صاحب ممدوح سے متعلق کر دیا جائے۔ علاوہ عمدہ تعلیم پانے کے طلباء کو ان کی برکت سے
روزانہ مستفید ہونے کا موقع ملے گا۔" لیکن سرسید نے یہ بات منظور نہیں کی اور جواب میں لکھا
"آپ نے اپنی طولانی تحریر کو ایسے عنوان سے شروع کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجھ کو مولوی
صاحب کے کام پر اعتماد نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ایسا عظیم الشان کام جو کہ کالج کی جان ہے ان
کے سپرد ہرگز نہ کرتا۔ مجھے ان پر بڑا اطمینان ہے۔ وہ صدہا علماء میں سے اس جلیل القدر کام
کے لیے منتخب کیے گئے۔"(۱)

چنانچہ مندرجہ بالا شواہد ڈاکٹر بٹالوی کے عائد کردہ الزامات کی سختی سے تردید کرتے ہیں
کہ تمام جید علماء نے سرسید کو کافر اور واجب القتل قرار دیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر بٹالوی تحریر فرماتے ہیں کہ جناح کفر کے فتووں سے بے نیاز ہی نہیں
بالاتر بھی تھا اور وہ اور ہی قسم کی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس نے مولویوں کے اکھاڑے میں اترنے سے
انکار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے بڑے بڑے پیشہ ور مولوی جن میں بڑے بڑے تھانوی
بڑے بڑے عثمانی بڑے بڑے ندوی بڑے بڑے مدنی شامل تھے اس کا بال بھی بیکا نہ کر
سکے کفر کا فتویٰ تو الگ رہا انجام کار دنیا نے دیکھ لیا کہ بڑے بڑے حاملان شرع متین، بڑے
بڑے مدعیان زہد و ورع اور بڑے بڑے زبدۃ العارفین اور عمدۃ السالکین کو گردن جھکا کر
جناح کے پیچھے پیچھے چلنا پڑا۔"(۲)

---

(۱) شمس تبریز خان، صدر یار جنگ (ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۹۸۲) ص ۱۲۸

(۲) ہماری قومی جد و جہد (۱۹۳۸) ص ۶۱-۶۲

ڈاکٹر بٹالوی یہ تحریر لکھتے وقت بالکل جذبات کی رو میں بہہ گئے اور وہ کچھ لکھ ڈالا جس کا
حقیقت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ غالباً ڈاکٹر بٹالوی کا مطالعہ اس باب میں بالکل محدود
ہے۔ اول تو ایک علمی اور تاریخی کتاب میں اس قسم کے جذباتی القاب استعمال کرنا مناسب
نہیں۔ لیکن یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علماء کے متعلق اس بدگمانی کا بھی ازالہ کر دیا جائے۔

یہاں صرف ایک عالم مولانا اشرف علی تھانوی کا تذکرہ بیجا نہ ہوگا کہ آپ نے اپنی کتابوں کے
حقوق اپنے نام محفوظ نہیں کروائے اور اس طرح لاکھوں روپے کی رائلٹی سے محروم ہوئے
اور کتابوں کی تعداد بھی بارہ سو سے اوپر تھی۔ اگر یہ پیشہ ور مولوی اتنا ہی لالچی تھا اور مذہب
کو اپنا پیشہ بناتا تھا تو شاید وہ یہ غلطی ہرگز ہرگز نہ کرتا۔ شاید ڈاکٹر بٹالوی کو معلوم نہیں کہ ہندوستان
کی تحریک آزادی میں علماء نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے جن پیشہ ور علماء کے
نام لکھے ہیں ان میں صرف مولانا حسین احمد مدنی ہی تحریک پاکستان کے مخالف تھے باقی
تمام حضرات نے تحریک پاکستان کی نہ صرف زبانی بلکہ عملی تائید کی۔ یہ تمام حضرات قائداعظم
کی قیادت کو مسلمانوں کے لیے ناگزیر سمجھتے تھے۔ ان تمام حضرات نے نہ تو کبھی قائداعظم
کی قیادت پر کوئی شرعی اعتراض اٹھایا اور نہ ہی کبھی ان کے آگے پیچھے چلنے پر مجبور ہوئے۔
مولانا اشرف علی تھانوی کے سیاسی رجحانات اور تحریک آزادی میں ان کی خدمات کا تذکرہ
تو اصل کتاب میں ہے۔ یہاں صرف مختصر بیان کر دیا جائے کہ مولانا اشرف علی تھانوی،
قائداعظم اور خود ڈاکٹر بٹالوی سے زیادہ کانگریس کے مخالف تھے وہ کانگریس میں مسلمانوں
کی شرکت کو ان کی دینی موت کے مترادف سمجھتے تھے۔ ان کو مسلم لیگ کی حمایت پر
قتل کی دھمکی دی گئی۔ آپ نے ہمیشہ گاندھی کو عیار، دجال، چالاک، شاطر، طاغوت اور
شیطان کے القاب سے یاد کیا۔ مسلمانوں کی ایک [illegible] تنا اور دعا کی۔

قائد اعظم سے باقاعدہ خط و کتابت کرتے تھے۔ تھانہ بھون سے مسلم لیگ کے مختلف اجلاسوں میں وفود بھیجے ۱۹۴۰ء کے مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ میں آپ کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے آپ کو ۱۹۴۳ء کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے قائد اعظم کی زیر صدارت آپ کی وفات پر جو تعزیتی قرارداد پاس کی اس سے مسلم لیگی حلقوں میں مولانا کے مقام و مرتبے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک بڑے بڑے ندوی کا تعلق ہے ڈاکٹر بٹالوی کی مراد شاید مولانا سید سلیمان ندوی ہیں۔ یہ حقیقت سب کو بخوبی معلوم ہے کہ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تحریک خلافت کے بعد سیاست کو خیرباد کہہ کر اپنے آپ کو علمی کاموں کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ان کی کسی تحریر یا تقریر سے کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ انہوں نے کسی موقع پر مسلم لیگ یا قیام پاکستان کی مخالفت کی ہو۔ اس کے برعکس یہ ناقابل تردید حقیقت موجود ہے کہ سید صاحب نے قیام پاکستان اور مسلم لیگ کی حمایت فرمائی۔ کلکتہ کے مشہور اخبار "عصر جدید" مورخہ ۸ مارچ ۱۹۴۶ء میں ایک فتویٰ شائع ہوا ہے۔ یہ فتویٰ ڈھاکہ کے ایک شخص محی الدین کے استفسار کے جواب میں کہ آیا مسلم لیگ کی حمایت کرنا ضروری ہے کہ نہیں شائع ہوا۔ مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر حضرات نے یہ فتویٰ دیا کہ "اس وقت مسلمان کانگریس اور اس کی امدادی جماعتوں سے بالکل علیحدہ رہ کر صرف مسلم لیگ کی حمایت کریں اس پر سید سلیمان ندوی کے بھی دستخط موجود ہیں۔

جہاں تک بڑے بڑے عثمانی کا تعلق ہے۔ دو اصحاب ہی عثمانی مشہور ہیں۔ ایک مولانا شبیر احمد عثمانی اور دوسرے مولانا ظفر احمد عثمانی۔ یہ دونوں حضرات تحریک پاکستان کے سرکردہ اور سرگرم کارکن رہے ہیں۔ دونوں حضرات کے خیالات کا اندازہ ان کی تقاریر

اور تحریروں سے ہو سکتا ہے۔ مولانا ظفر احمد عثمانی نے ۱۹۴۵ء کے لیاقت کا علمی الیکشن میں جو اہم کردار ادا کیا اس کا اندازہ اس خط سے لگایا جا سکتا ہے جو لیاقت علی خان نے الیکشن کی کامیابی کے بعد مولانا ظفر احمد کو لکھا۔

لیاقت علی خان نے لکھا:

"میں انتہائی مصروفیتوں کے باعث اس سے قبل آپ کو خط نہ لکھ سکا مرکزی اسمبلی کے انتخاب میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں بڑی کامیابی عطا کی ہے۔ اس سلسلے میں آپ جیسی ہستیوں کی جد و جہد بہت باعث برکت ثابت ہوئی۔ آپ حضرات کا اس موقع پر گوشہ عزلت سے نکل کر میدان عمل میں آنا اور اس سرگرمی سے جد و جہد کرنا بہت مؤثر ثابت ہوا۔ اس کامیابی پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ خصوصاً اس حلقہ انتخاب سے جہاں ہماری جماعت نے مجھے کھڑا کیا تھا۔ آپ کی تحریروں اور تقریروں نے باطل کے اثرات بڑی حد تک ختم کر دیے ہیں۔ بہرحال اس سے بھی سخت معرکہ سامنے ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے بڑی امید ہے کہ دشمنان ملت اس معرکے میں بھی خاسر و نامراد ہوں گے امید ہے کہ اس حصے میں آپ کو فرصت مل جائے گی۔ اور آپ کی تحریریں، تقریریں، اور مجاہدانہ سرگرمیاں آنے والی منزل کی دشواریوں کو بھی معتد بہ حد تک ختم کر دیں گی۔"

سلہٹ اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں ان دونوں حضرات نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے، پرانے اخبارات کے فائل اس کے گواہ ہیں۔ ان دونوں عثمانیوں کو ان کی خدمات ہی کے پیش نظر نئی مملکت اسلامیہ کے پرچم کشائی کی رسم کی ادائیگی کا اعزاز بخشا گیا۔

تحریکِ خلافت اور مولانا اشرف علی تھانوی

مسلمانانِ برصغیر نے اپنی تاریخ میں کبھی بین الملّی رشتۂ اخوت کی عالمگیر حقیقت کو اتنی اہمیت دی ہو جتنی تحریکِ خلافت کے دوران دی۔ جنگِ عظیم اول کے بعد ہندوستانی سیاست میں شدید طوفان آیا جس میں بیرونی سیاست کی موجیں بھی مل گئیں۔ خلافت کے مسئلے نے ہر ہندوستانی مسلمان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔

جنگِ عظیم شروع ہونے سے قبل ہی مسلمانوں کے جذبات مجروح کیے جا چکے تھے۔ مسلمان ممالک پر یورپی قوتوں کے حملے اور قبضے نے مسلمانوں کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت بھر دی۔ لیبیا پر اٹلی کا قبضہ، مراکش پر فرانس کا انتداب اور بلقان پر حملہ یہ سب واقعات ۱۹۱۳ء میں پیش آئے اور ان کا مسلمانوں پر بہت اثر پڑا۔

ادھر ہندوستان میں مولانا شوکت علی نے مولانا عبدالباری کے ساتھ مل کر انجمن خدام کعبہ کی بنیاد رکھی۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس کو غیر مسلموں کے ہاتھ میں جانے سے بچایا جائے۔ طرابلس پر اٹلی کے حملے نے تمام عالم اسلام میں غم و غصے کی لہر دوڑا دی تھی۔ اس حادثے سے مسلمانانِ ہند کے جذبات کو کس قدر ٹھیس پہنچی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایم اے او کالج علی گڑھ کے طلبا نے نہ صرف اپنی جیب خرچ سے رقم بچا کر بلکہ اپنے کمروں کا

آرائشی سامان بیچ کر تمام رقم طرابلس کے چندے میں جمع کروائی۔ طلبہ نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ جب تک جنگ طرابلس جاری ہے زردہ، پلاؤ اور فرنی کا استعمال ترک کر کے اس کی بچت کو فنڈ میں جمع کروایا جائے۔ اس کے بعد جب بلقانی ریاستیں بھی جنگ کی لپیٹ میں آ گئیں تو مسلمانانِ ہند کی ہمدردی کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی اور علی گڑھ کے طلبہ نے ایک وقت گوشت کھانا چھوڑ دیا۔[1]

ابھی مسلمانوں کے زخموں سے خون رس ہی رہا تھا کہ جنگِ عظیم اول کا آغاز ہو گیا اس جنگ میں ترکی جرمن کے حلیف اور برطانیہ کے حریف کی حیثیت سے شامل ہوا۔ برطانیہ کو یقین تھا کہ مسلمانانِ ہند ترکی کو کسی صورت بھی کسی مشکل میں گرفتار دیکھنا برداشت نہیں کریں گے۔ اور دوسری جانب چونکہ اس کو ہندوستانی مسلمانوں سے اس جنگ میں مدد بھی لینی تھی۔ اس لیے برطانوی وزیرِ اعظم لائیڈ جارج نے پارلیمنٹ میں یہ اعلان کیا کہ "ہم یہ جنگ اس لیے نہیں لڑ رہے کہ ترکی کو تھریس اور ایشیائے کوچک کی زرخیز اور مشہور سرزمین سے محروم کر دیں جس کی آبادی کی اکثریت ترکی النسل ہے۔"[2] لیکن جنگِ عظیم میں فتح حاصل کرنے کے بعد برطانیہ نے مسلمانوں سے کیے گئے وعدوں کو فراموش کر دیا اور ترکی کے حصے بخرے کر دیے۔ ترکی پر زبردستی معاہدہ سیورے ٹھونس دیا گیا۔ اس معاہدے نے سلطنتِ عثمانیہ کو ختم کر کے ترکی سیادت کو عملاً ختم کر کے نہ صرف غیر ترکی علاقے بلکہ بعض ایسے علاقے مثلاً سمرنا، تھریس اور اناطولیہ جس میں ترکوں کی اکثریت تھی چھین لیے گئے۔ اس معاہدے نے بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی "برعظیم کے مسلمانوں کے جذبات

۱۔ ابن زبیری، ضیائے حیات (کراچی ۱۹۵۲ء)، ص ۵۱

۲۔ سید حسن ریاض، پاکستان ناگزیر تھا (کراچی ۱۹۶۷ء)، ص ۴۴

کو اس قدر مشتعل کر دیا کہ اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ سارے جذبات جو ایک عرصے
سے دبے ہوئے تھے۔ ایک ایسی تحریک کی شکل میں پھوٹ پڑے جس نے برعظیم میں
برطانوی سلطنت کی جڑوں کو ہلانے میں وہ کردار ادا کیا جو اس سے پہلے کسی تحریک نے
نہیں کیا" (۱)

ادھر ہندوستان میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے مجلس خلافت تشکیل دی۔ ساتھ ہی
آل انڈیا خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا جس کا پہلا اجلاس بمقام دہلی ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو
مولوی اے کے فضل الحق کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مسلمانوں سے اپیل
کی گئی کہ وہ برطانوی مال کا بائیکاٹ کریں اور جشن فتح میں کوئی حصہ نہ لیں (۲)

ادھر امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا جس نے ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے میں
بہت مدد دی۔ بقول گاندھی "ہندو مسلم اتحاد کا ایسا موقعہ شاید آئندہ سو سال میں بھی پیدا نہ
ہوتا" (۳) تحریک خلافت ہندوستان کی پہلی تحریک تھی جس میں عوام نے بے پناہ جوش و
خروش سے حصہ لیا۔ برعظیم پاک و ہند کی تاریخ میں یہی ایک مختصر عرصہ تھا جس میں ہندوؤں
اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا۔

تحریک خلافت کے دوران میں تحریک کے مقاصد کے حصول کے لیے جو طریق کار
اختیار کیے گئے اور اس تحریک پر گاندھی کے چھا جانے کے سبب مولانا اشرف علی تھانوی

۱۔ اشتیاق حسین قریشی برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ (کراچی ۱۹۶۸ء) ص ۳۵۴

Francis Robinson Separatism Among Indian Muslims (Cambridge 1974) p 301.

Uma Kaura Muslims and Indian Nationalism (Delhi 1977) p.22.

نے قائد اعظم محمد علی جناح (۱) اور علامہ اقبال کی مانند تحریک سے علیحدگی اختیار کی۔ مولانا
تھانوی کو تحریک کے اغراض و مقاصد سے قطعاً کوئی اختلاف نہیں تھا۔ آپ نے خلافت
کو اجماعی مسئلہ بتلایا جس سے اختلاف ممکن نہیں۔

مولانا تھانوی کو تحریک خلافت، ملت اسلامیہ کے تحفظ، مقامات مقدسہ کے تحفظ اور
امداد سے کوئی اختلاف نہ تھا۔ اختلاف صرف طریق کار سے تھا چنانچہ اسی بنا پر آپ نے
تحریک خلافت میں شرکت نہ فرمائی۔ اس سے قبل ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کے موقعہ پر آپ
نے ترکی کی امداد کے سلسلے میں کئی جلسوں سے خطاب کیا۔ اور مسلمانوں کی توجہ ترکی کی بھرپور
مدد کی طرف مبذول کرائی۔ مولانا تھانوی نے ، اپریل ۱۹۱۳ء کو دہلی میں ایک بہت بڑے
جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مسلمانان ہند کو اپنے مجروح ترک بھائیوں، یتامیٰ اور بیوگان
کی امداد کی ترغیب دلائی۔ اس جلسے سے آپ نے مسلسل ۴½ گھنٹے خطاب کیا (۲) اس
لیے آپ کو ترک بھائیوں کی امداد، خلافت کی بقا اور سلطنت اسلامیہ کے تحفظ کا اتنا ہی فکر و خیال
تھا جتنا کسی اور مسلمان کو ہو سکتا تھا لیکن مسلمان زعماء نے تحریک خلافت کے دوران اپنے مقاصد
کے حصول کے لیے جو حربے اور طریق کار اختیار کیے مولانا نے ان کو شرعی نکتہ نگاہ سے جانچا

۱۔ Jinnah and the Khilafat Movement

Journal of South Asian and Middle Eastern Studies. December 1977 pp.92-107.

ڈاکٹر معین الدین عقیل کا مضمون "تحریک خلافت اور قائد اعظم" مجلہ علم و آگہی (قائد اعظم نمبر) ۱۹۷۶ء ص ۱۳۵

۲۔ روزنامہ پیسہ اخبار ۱۴ اپریل ۱۹۱۳ء ص ۶

اور خلاف شرع پاتے پر ان کی سختی سے مخالفت کی۔ مولانا کو اس امر پر شدید اعتراض تھا کہ ایک اسلامی مقصد کے حصول کے لیے غیر اسلامی تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔

مولانا کو اس امر پر سخت دکھ تھا کہ مسلمانوں نے اپنے مقصد کے حصول کے وقت شرعی حدود کو مدنظر نہیں رکھا۔ چنانچہ ایک مجلس میں فرمایا کہ "تدابیر کو کون منع کرتا ہے تدابیر کریں مگر حدود شرعیہ میں رہ کر البتہ غیر شرعیہ اور ممنوعہ تدابیر سے منع کیا جاتا ہے چونکہ مسلمانوں نے تدابیر غیر شرعیہ کو اپنی کامیابی کا زینہ بنایا ہے تو اس صورت میں اول تو کامیابی مشکل ہے اگر ہو بھی گئی تو ہندوؤں کو ہوگی اور اگر مسلمانوں کو ہوئی تو ہندو نما مسلمانوں کو ہوگی"[۱]

مولانا نے اپنے ملفوظات میں بار بار اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر مسلمان بھی اپنے مقصد کے حصول کے لیے غیر شرعیہ تدابیر اختیار کرتے ہیں اور ان کو حکومت حاصل ہو بھی گئی تو فرعون شداد اور نمرود کی حکومت اور اس حکومت میں کیا فرق ہوگا۔ اس لیے مولانا کا مشورہ تھا کہ جو کام بھی کیا جائے حدود شریعت میں رہ کر کیا جائے۔[۲]

تحریک خلافت کے دوران ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط بنانے کی غرض سے مسلمان بہت سی غیر اسلامی حرکات کے مرتکب ہوئے۔ انہوں نے ماتھے پر قشقے لگائے اور ہے کے نعرے بلند کئے۔ ہندوؤں کی ارتھی کو کندھے دیے۔ مساجد میں کافروں کو بٹھا کر منبر رسول کی بے حرمتی کی۔ رام لیلا کا انتظام کیا۔ ایک عالم دین نے "آیات و احادیث" میں گزری ہوئی زندگی کو ایک کافر بت پرست پر نثار کرنے کا اعلان کر ڈالا۔ ایک اور لیڈر نے انکشاف کیا کہ اگر ختم نبوت نہ ہوتی تو گاندھی مستحق نبوت تھا۔ یہ تمام قابل اعتراض امور مولانا کو سخت ناپسند اور ناگوار گزرے

۱۔ "الافاضات یومیہ" جلد ششم ص ۲۰۰

۲۔ "الافاضات یومیہ" جلد چہارم ص ۶۱۰

اس لیے آپ کے ملفوظات میں بار بار ان باتوں کی مذمت ملے گی۔[۱]

مولانا تھانوی کا تیسرا اعتراض یہ تھا کہ مسلمان لیڈروں نے گاندھی کے اقوال کو حجت بنا لیا تھا اور وہ لیڈر اس بات کے منتظر رہتے تھے کہ جو ہی گاندھی کے منہ سے کوئی بات نکلے اس کو فوراً قرآن و حدیث پر منطبق کر دیا جائے۔ چنانچہ اس تحریک کے دوران گاندھی نے جو بھی تدابیر پیش کیں۔ ان کم فہم علماء نے ان کو قرآن و حدیث پر منطبق کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے آپ بار بار ایسے لوگوں کی عقل و فہم پر اظہار افسوس کرتے کہ "جو بات گاندھی کے منہ سے نکل جائے فوراً اس کو قرآن و حدیث پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس تحریک میں کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں جو کسی مسلمان یا عالم کی تجویز ہو۔ دیکھئے ہوم رول گاندھی کی تجویز، بائیکاٹ گاندھی کی تجویز، کھدر گاندھی کی تجویز، ہجرت کا مسئلہ گاندھی کی تجویز غرض کہ جملہ تجویزیں اس کی ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس نے جو کہا لبیک کہہ کر اس کے ساتھ ہو گئے۔ کچھ تو غیرت آنی چاہیئے۔ ایسے بدفہموں نے اسلام کو سخت بدنام کیا ہے۔ سخت صدمہ ہے سخت افسوس ہے اس کی باتوں کو قرآن و حدیث سے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔"[۲]

اس سلسلے میں ایک کم فہم مقرر کا واقعہ بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "اس وقت مسلمانوں کو نہ تو دین کی پرواہ تھی نہ شعائر اسلام کی طرف توجہ بس ایک ہی بات کی ہوش تھی کہ گاندھی کے منہ سے جو بات نکل جائے اس کو قرآن و حدیث سے ثابت کرتے یہاں تک کہ سہارن پور میں ایک وعظ ہوا ایک مقرر نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر سوراج

۱۔ "الافاضات الیومیہ" جلد ششم ص ۱۰۹

۲۔ "الافاضات الیومیہ" جلد اول ص ۸۹، ۹۰

مل گیا تو ہندو اذان نہ ہونے دیں گے تو کیا بلا اذان نماز نہیں ہو سکتی۔ کہتے ہیں کہ گائے کی قربانی بند کردیں گے تو کیا بکرے کی قربانی نہیں ہو سکتی۔ کیا گائے کی قربانی واجب ہے"

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد مولانا تھانوی نے اس طرزِ فکر پر گہرے دکھ اور رنج کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ "اس مقرر کے بیان میں ایک بات باقی رہ گئی۔ اگر وہ یہ بھی کہہ دیتا تو کوئی جھگڑا ہی باقی نہ رہتا کہ اگر ہندوؤں نے اسلام اور ایمان پر زندہ رہنے نہ دیا تو کیا بغیر ایمان اور اسلام کے زندہ نہ رہیں گے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے دوست نما دشمن ہیں۔ اس بدفہم سے کوئی پوچھتا کہ جب شعائرِ اسلام کو چھوڑنے کی مسلمانوں کو ترغیب دے رہا ہے تو پھر انگریزوں ہی میں جذب ہو جا عیسائیت ہی قبول کر لے۔ ابھی شعائرِ اسلام اور اسلام کو چھوڑنا ہی ہے تو اس میں کیا ہندو کیا انگریز بلکہ تیری محبوب دنیا ہندو سے زیادہ انگریز کے پاس ہے۔"(1)

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ ہندو مسلم اتحاد کے جوش میں کچھ مسلمانوں نے مشہور متعصب ہندو لیڈر شردھانند (جس نے آگے چل کر مسلمانوں کے خلاف شدھی کی تحریک چلائی) کو جامع مسجد دہلی میں لے جا کر اس کا وعظ کروایا۔ مولانا تھانوی کو اس واقعہ پر سخت صدمہ پہنچا اور آپ نے مسلمانوں کو شرم دلائی کہ وہ یہ حرکت کر کے منبرِ رسول کی سخت بے حرمتی کے مرتکب ہوئے ہیں۔

تحریکِ خلافت کے دوران ہندو مسلمان دونوں مختلف جلسوں اور جلوسوں کے دوران اپنی لیڈروں کی جے بولا کرتے تھے۔ مولانا تھانوی کے نزدیک مسلمانوں کا یہ فعل بھی شرعی نکتہ نگاہ سے قابلِ اعتراض تھا کیونکہ لفظ جے شعائرِ کفر تھا اس لیے مولانا کے نزدیک

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص ۸۶

مسلمانوں کا شعائرِ کفر اختیار کرنا کسی بھی حالت میں مستحسن فعل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ آپ نے تحریک کے حامی ایک صاحب سے یہ پوچھا کہ آپ جے کیوں بولتے ہیں؟ انہوں نے کہا اس میں حرج کی کیا بات ہے۔ جے کے معنی فتح کے ہیں۔ اس پر مولانا تھانوی نے فرمایا کہ "تم رام رام کیوں نہیں کہتے۔ جس طرح رام رام کہنا شعائرِ کفر میں سے ہے اسی طرح جے کہنا بھی شعائرِ کفر میں سے ہے۔"(1)

تحریکِ خلافت میں مسلمانوں کا جوش ان کے ہوش پر غالب آ گیا تھا اس لیے ان سے بعض ایسی حرکات سرزد ہوئیں جو اسلام کے بالکل منافی تھیں۔ مولانا تھانوی کا مسلمانوں کو مشورہ تھا کہ کام جوش سے نہیں ہوش سے کیے جائیں اور تمام امور سر انجام دیتے وقت اس امر کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ "ہمارا یہ کام اسلام کے احکام سے متصادم تو نہیں" مولانا کو تحریکِ خلافت کے قائدین اور شرکاء سے یہی گلہ تھا کہ انہوں نے اس بنیادی اصول کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نکتہ پر گفتگو کرتے ہوئے آپ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ "یہ مسلمان بھی عجیب چیز ہیں جہاں کوئی نئی بات سنی کہ کھڑا ہوا فوراً لبیک کہہ کر اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ دوست دشمن کی قطعاً کوئی شناخت ہی نہیں۔ نہ اس کی پرواہ کہ ہمارا کام اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے منافی تو نہیں۔ مسلمانوں کو تو کسی کام کے کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ اس کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ تب آگے قدم بڑھانا چاہیئے۔ یہ ہڑبونگ تو کسی طرح مناسب نہیں"(2)۔ ایک اور سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ "اصول کے تحت ہو کر کام کرو جوش سے کام مت لو۔ جوش کا انجام خراب

۱۔ "الافاضات الیومیہ" جلد چہارم ص ۶۱۱
۲۔ "الافاضات الیومیہ" جلد ششم ۱۰۹

ہوگا۔ حدودِ شرعیہ کی حفاظت کرو۔ حضرات صحابہ تو مین قتال کے وقت بھی حدودِ شرعیہ کی حفاظت اور رعایت فرماتے تھے۔"[1] مولانا اس سلسلے میں مثال دیا کرتے تھے کہ جوش کے جس قدر کام ہوتے ہیں ناپائیدار ہوتے ہیں اور کچھ دنوں میں ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو کام تفکر و تدبر کے ساتھ تدریجاً انجام دیے جاتے ہیں وہ محکم اور باثمر ہوتے ہیں۔ دیکھئے تیز بارش سے پیداوار نہیں ہوتی ہلکی بارش سے کھیتی خوب لہراتی ہے۔" (۲)

مولانا اپنے اصولوں کی سختی سے پابندی کرنے اور دوسروں سے کرانے کے لیے مشہور تھے۔ اسی لیے تحریکِ خلافت سے متعلق ہر امر کے بارے میں آپ کا یہی خیال تھا کہ ہر کام قاعدے اور اصول کے تحت کیا جائے اور اگر ہر کام قاعدے سے کیا جائے۔ حدودِ شرعیہ کا لحاظ رکھا جائے تو پھر اپنے مقصد کے حصول کی خاطر جان بھی قربان کی جا سکتی ہے لیکن ان دونوں باتوں کی غیر موجودگی میں تحریک میں شرکت کا سوال خارج از بحث تھا، اس لیے جو لوگ آپ کی تحریکِ خلافت میں عدمِ شمولیت پر اعتراض کیا کرتے تھے۔ آپ انہیں یہی جواب دیتے کہ "اگر تمہاری موافقت کی جائے تو ایمان جاتا ہے کہ اس میں حدودِ شریعت کا تحفظ نہیں۔ اگر مخالفت کی جائے تو جان جاتی ہے اس لیے کہ مدافعت کی طاقت نہیں ہے اور ایمان اور جان ایسی سستی چیزیں نہیں ہیں کہ دونوں کو خطرے میں ڈال دوں۔ جان خدا کی راہ میں دینے سے انکار نہیں مگر اصول اور قاعدہ کے ساتھ ہو۔ اگر اصول اور قاعدے کے ساتھ ہو تو ایسی ایک کیا کروڑوں جانیں قربان ہیں۔"(۳)

۱۔ قاضی محمد عیسیٰ "کمالاتِ اشرفیہ" الہ آباد ۱۳۵۳ھ، ص ۱۰۳

۲۔ ابرار الحق حقی "اسعد الابرار" بارہ بنکی ۱۹۳۶ء ص ۱۱۵

۳۔ "الافاضات الیومیہ" جلد چہارم ص ۹۵

ہندوؤں کے متعلق مولانا تھانوی کے خیالات

مولانا تھانوی کے نزدیک ہندو مسلمانوں کے اول درجہ دشمن تھے۔ آپ کے ملفوظات میں جہاں کہیں ہندوؤں کا ذکر آیا ہے آپ نے ان کے لیے سخت ترین الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مولانا تھانوی کو اس بات پر ہندوؤں سے سخت گلہ اور شکوہ تھا کہ انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ لڑی اور وہ بھی اس میں برابر کے شریک تھے مگر جنگ آزادی کے خاتمے پر وہ نہ صرف انگریزوں سے مل گئے بلکہ انہوں نے مسلمانوں کی مخبریاں کر کے انہیں پھانسی پر چڑھوا دیا۔ اسی سلسلے میں فرمایا کہ "یہ قوم (ہندو) نہایت احسان فراموش ہے مسلمانوں کو تو اس سے سبق سیکھنا چاہیئے کہ انگریزوں کی خدمت کے صلے میں جو مسلمانوں کے ساتھ سلوک کیا وہ ظاہر ہے۔ دیکھو غدر سب کے مشورے سے شروع ہوا جو کچھ بھی ہوا مگر اس پر مسلمانوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ بڑے بڑے رئیس اور نواب ان کی (ہندوؤں) بدولت تختۂ دار ہو گئے پھر تحریک کانگرس میں مسلمانوں نے حصہ لیا۔ بڑی بڑی قربانیاں دیں اس کا صلہ شدھی کے سلسلے سے ادا ہوا۔ آئے دن کے واقعات اس کے شاہد ہیں کہ ہر جگہ جہاں مسلمانوں کی آبادی قلیل تھی پریشان کر دیا۔ مگر ان باتوں کے ہوتے ہوئے بھی بعض بدفہم اور بے سمجھ ان کو دوست سمجھ کر ان کی بغل میں گھستے ہیں۔"(۱)

ایک اور مجلس میں ہندوؤں کے اس طرزِ عمل کے متعلق فرمایا کہ "ہندوؤں کی قوم مالی جو نہیں ان کے وعدے وعید کا اعتبار نہیں۔ غدر مسلمانوں اور ہندوؤں کے اتفاق سے ہوا تھا مگر جب وقت آن پڑا تو حکومت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور مخبریاں کرا کر ہزاروں رئیسوں اور مسلمانوں کو غدار کروا دیا۔ انگریزوں سے اگر دشمنی کی بنا یہ ہے کہ اسلام کے دشمن ہیں تو ہندو ان سے زیادہ مسلمانوں اور اسلام کے دشمن ہیں۔"(۲)

مولانا تھانوی اگرچہ انگریزوں کو بھی مسلمانوں اور اسلام کا دشمن قرار دیتے تھے لیکن

۱۔ "الافاضات الیومیہ" جلد چہارم ۵۲۵

۲۔ "الافاضات الیومیہ" جلد چہارم ۴۵۳-۴۵۲

ہندوؤں کے مسلم کش رویے کو دیکھتے ہوئے آپ اس قطعی نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندو انگریزوں سے
زیادہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ مولانا یہ دیکھ کر سخت حیران ہوتے تھے کہ اگرچہ
انگریز اور ہندو دونوں ملت کفریہ میں شامل تھے لیکن مسلمان انگریز دشمنی میں تو بہت آگے
بڑھے ہوئے تھے مگر ہندوؤں کے بارے میں ان کا رویہ یکسر مختلف تھا اور وہ انہیں مسلمانوں
کا دوست تصور کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ "بعض حضرات کی رائے ہے کہ کفار سے
استخلاص وطن ضروری ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بالکل صحیح ہے، مگر یہ کون سی کتاب میں لکھا ہے
کہ کفار سے مراد ایک ہی قوم ہے۔ دوسری قوم تو بہت پکی مسلمان ہے اور اس سے
استخلاص وطن ضروری نہیں ہیں تو کہتا ہوں کہ پہلی قوم سے زیادہ دوسری قوم مسلمانوں اور
اسلام کی سخت دشمن ہے۔"(1)

مولانا تھانوی تمام کفار کو "ناگ" سے تشبیہ دیا کرتے تھے اور اس میں سفید اور کالے کی
تمیز روا نہیں رکھتے تھے بلکہ آپ کی رائے تو یہ تھی کہ گورے سانپ سے زیادہ زہریلا ناگ
تو کالا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر گورے سانپ کو گھر سے نکال دیا جائے تو کالا تو ڈسنے
کو موجود ہے۔ اور جس کا ڈسا ہوا زندہ رہنا ہی مشکل ہے۔"(2)

مولانا تھانوی ہندوؤں کے اس وجہ سے مخالف تھے کہ انہوں نے مسلمانوں کو
بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ ایک مجلس میں فرمایا کہ "بعض کفار پر تو مجھے بہت ہی غیظ
ہے۔ ان کی وجہ سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا اور ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں، ہجرت
کا سبق پڑھایا، شدھی کا مسئلہ اٹھایا، مسلمانوں کو عرب جانے کی آواز اٹھائی۔ قربانی گاؤ پر

۱۔ "الافاضات الیومیہ" جلد پنجم ۲۳۲
۲۔ "الافاضات الیومیہ" جلد ششم ۱۹۷

انہوں نے اشتعال دیا۔ یہ لوگ مسلمانوں کے جانی دشمن ہیں بلکہ ایمان جان و مال وجاہ مسلمانوں
کی سب چیزوں کے دشمن ہیں۔"(1) آپ فرمایا کرتے تھے کہ جب تک ہم کلمہ پڑھتے ہیں تمام
غیر مسلم ہمارے دشمن ہیں اس میں گورے کالے کی کوئی قید نہیں۔"(2) مولانا اس امر پہ حیرت
کا اظہار فرماتے کہ ہندوستان میں دو کافر قومیں موجود ہیں پھر کیا بات کہ ایک ہی قوم سے
اس قدر دشمنی کیوں دوسری قوم سے کیوں نہیں(3) ایک اور مجلس میں فرمایا کہ بعض لوگ کفار
کی ایک جماعت کو برا کہتے ہیں بعض دوسری کو۔ میں کہتا ہوں دونوں برے ہیں فرق
صرف یہ ہے کہ ایک نجاست مرئیہ ہے اور دوسری غیر مرئیہ لیکن ہیں دونوں نجاست۔"(4)

ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہندو مسلمانوں پہ آئے دن جو مظالم کیا کرتے تھے
مولانا نے ان پہ اکثر اپنے غیظ و غضب کا اظہار کیا۔ ایک مجلس میں فرمایا کہ اگر رات دن
مسلمانوں پر مظالم کیے جائیں قتل و غارت کیا جائے کچھ نہیں۔ لیکن اگر مسلمان انتقام میں بھی
یہی کریں تو گنوار ہیں وحشی ہیں۔ خود وحشی اور گنوار ہیں اور دوسروں کو وحشی سمجھتے ہیں(5)

مولانا کے نزدیک اہل کتاب کی دشمنی اور مشرکین کی دشمنی کے درمیان ایک فرق
موجود تھا۔ آپ کے خیال میں اہل کتاب دین کے دشمن نہیں دنیا کے دشمن ہیں۔ گو اس
کے ضمن میں وہ دین کی دشمنی بھی کر جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مشرکین دین کے دشمن

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد پنجم ص ۱۵۰
۲۔ ایضاً ص ۱۷۷
۳۔ ایضاً ص ۳۵۶
۴۔ الافاضات الیومیہ جلد دوم ص ۳۰۲
۵۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص ۲۲۲

ہیں۔ اس کا معیار یہ ہے کہ جس قدر قوت اور سطوت اہل کتاب کو حاصل ہے اگر مشرکین کو حاصل ہو جائے تو ہندوستان میں مسلمانوں کا بیج تک نہ چھوڑیں۔(۱)

مولانا ہندوؤں کو "بزدل" "خود غرض" اور کم حوصلہ قوم" کے نام سے یاد کرتے تھے آپ کی رائے میں جو بھی برائے نام بہادری ان کے اندر پیدا ہوئی تھی وہ ان تحریکات کی بدولت ان میں پیدا ہوئی تھی۔ مولانا ان کی بہادری کو "بندر بھبکی" سے تشبیہہ دیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ جہاں کہیں خانہ جنگی ہوئی ہے میدان میں ان کو کہیں فتح نہیں ہوئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوٹھے پر چڑھ کر اینٹیں برسا دیں۔ یا جہاں سارے گاؤں میں دو چار گھر مسلمانوں کے ہوئے وہاں سارے گاؤں نے مل کر مسلمانوں کو نقصان پہنچا دیا۔(۲)

ایک اور موقع پر فرمایا کہ "اگر ہندوؤں کو انگریزوں کی طرح قوت حاصل ہوتی تو ہندوستان میں ایک بچہ بھی زندہ نہ چھوڑتے۔(۳)" ہندو قوم کے متعلق ایک عام تاثر یہ ہے کہ وہ بے ضرر قوم ہے اور وہ کسی بھی جاندار کا خون بہانے سے گریز کرتی ہے لیکن مشاہدات و واقعات اس کے برعکس تھے جہاں ہندوؤں کو موقع ملتا تھا وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے سے گریز نہ کرتے تھے جس گاؤں یا علاقے میں مسلمان اقلیت میں ہوتے ہندو وہیں ان کو سب سے زیادہ نقصان پہنچاتے۔ ہندوؤں کے اس طرزِ عمل پر مولانا تھانوی نے ان کی سخت مذمت کی۔ اور انہیں "بے رحم" "بے درد" اور کم حوصلہ قوم" قرار دیا۔

مسلمانوں نے ہندو رسومات اور طرزِ معاشرت کو اپنانے کی جو روایت شروع کر دی

۱۔ "الافاضات الیومیہ" جلد چہارم ص ۳۰۸

۲۔ "الافاضات الیومیہ" جلد سوم ص ۱۷

۳۔ "الافاضات الیومیہ" جلد ششم ص ۱۰۲

تھی مولانا کو اس پر سخت افسوس تھا۔ مسلمانوں کی اس روش پر دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "بڑے شرم کی بات ہے کہ ہم نے کثرت سے ہندو رسومات اختیار کر رکھی ہیں۔ بھلا ہندوؤں نے بھی ہماری کوئی رسم لی ہے۔ قطع نظر گناہ سے غیرت بھی کوئی چیز ہے۔ ہمارے ہاں ان کی ساری رسوم موجود ہیں۔ حالانکہ مشرکین کی کوئی بھی بات نہیں لینی چاہیئے۔ ہمارے اسلام میں اپنی تعلیمات کافی ہیں اور سب سے اچھی ہیں۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ ہم دوسروں کی معاشرت لیتے پھریں(۱)

ان تمام باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے مولانا تھانوی اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ "قیامت آجائے ہندو کبھی مسلمان کے خیر خواہ اور ہمدرد نہیں ہو سکتے"(۲)

گاندھی، مولانا تھانوی کی نظر میں

اگر مولانا تھانوی کے ملفوظات پر ایک نظر ڈالی جائے تو سب سے نمایاں بات یہ نظر آتی ہے کہ آپ نے گاندھی کے متعلق جس قدر غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے شاید ہی کسی اور لیڈر کے خلاف کیا ہو۔ ہندوؤں کے مسلم کش رویے کے پیش نظر آپ کو ان پر قطعاً اعتبار نہیں تھا۔ اس لیے آپ نے جگہ جگہ ہندوؤں کے لیڈر گاندھی کے متعلق طاغوت دجال، شیطان، مکار، عدو اسلام اور بدفہم کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ایک مجلس میں فرمایا کہ "اس چودھویں صدی میں ایک طاغوت ظاہر ہوا ہے اس کو کہتے ہیں کہ بڑا عاقل اور بیدار مغز ہے۔ بدعقل کو عاقل سمجھتے ہیں۔"(۳) فرمایا "فلاں سیاسی کافر کم بخت دجال سے کم نہیں

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد سوئم ص ۳۴۹

۲۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ۲۳۸ ۳۔ الافاضات الیومیہ جلد پنجم، ص ۴۸

نہ معلوم کتنے لوگوں کے ایمان خراب کئے اور دجال کیا کرے گا وہ بھی یہی کرے گا۔"(۱)

ایک مقرر نے ہندو مسلم اتحاد کے جوش میں آکر کہا کہ اگر ختم نبوت ختم نہ ہوتی تو گاندھی مستحق نبوت تھا۔ اس مقرر کی اس ہرزہ سرائی پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "حیرت ہے کہ ایسا کم فہم بھی ہوتا۔ اگر ایسا فہیم ہوتا تو پہلے آخرت پر ایمان لاتا"(۲)

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ مولانا تھانوی کی رائے میں تحریک خلافت کے دوران جتنی تجاویز سامنے آئیں وہ تمام تر گاندھی کی سوچ کا نتیجہ تھیں۔ مولانا کو مسلمانوں کے اس طرز فکر و عمل پر سخت افسوس تھا کہ گاندھی جب بھی کسی نئی سکیم پیش کرتا ہے مسلمان کے لیڈر اس کو قرآن و حدیث پر منطبق کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے متعلق فرمایا کہ "جو گاندھی کے منہ سے نکل جائے اس کو قرآن و حدیث میں ٹھونسنا ان کا کام ہے۔ دیکھ لیجئے اتنا زمانہ گزر گیا ہے کہ گاندھی نے کوئی نئی سکیم کا اعلان نہیں کیا سب خاموش ہیں۔ اب وہ کسی نئی سکیم کی فکر میں ہو گا وہی سکیم مسلمانوں کو قرآن و حدیث میں نظر آنے لگے گی۔"(۳)

تحریک خلافت کے دوران مولانا تھانوی سے یہ سوال بار بار کیا گیا کہ مسلمان گاندھی کی اندھا دھند پیروی کیوں کر رہے ہیں۔ اس کے جواب میں آپ فرماتے کہ گاندھی چونکہ دنیا کی دعوت دے رہا ہے اس لیے دنیا کے پجاری اس کے ساتھ ہیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے آپ سے یہ دریافت کیا کہ کیا مسلمانوں میں کوئی شخص گاندھی جیسا سیاست دان نہیں کہ لوگ اس کی پیروی کریں۔ آپ نے فرمایا کہ "اگر آپ ذرا غور و فکر سے کام لیتے

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد سوم ۳۹۲

۲۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ۴۶۸

۳۔ الافاضات الیومیہ جلد اول ۸۸

تو یہ سوال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی مجھ کو یقین بلکہ عین الیقین ہے کہ مسلمانوں میں ایک نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں گاندھی جیسے نہیں بلکہ اس سے کہیں زائد معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر مسلمان ان کی پیروی نہ کریں تو ان کی کیا خطا ہے۔"(۱)

ایک مصنف نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے بارے میں ایک کتاب لکھی جس میں لکھا کہ انبیاء کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ ان میں استقلال تھا اور اس کی زندہ نظیر گاندھی موجود ہے۔ مولانا تھانوی نے مصنف کے اس جملے پر سخت گرفت کرتے ہوئے فرمایا "نعوذ باللہ سیرت نبوی پر کتاب اور نبی کو ایک مکذب نبوت سے تشبیہ۔"

مولانا تھانوی کے نزدیک یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا دشمن ہو، توحید کا منکر ہو وہ کس طرح مسلمانوں اور اسلام کا ہمدرد و خیر خواہ اور دوست ہو سکتا ہے آپ نے فرمایا "میں نے اسی لیے شباب تحریک کے زمانے میں کہہ دیا تھا کہ جو شخص توحید اور رسالت کا منکر ہو وہ اسلام اور مسلمانوں کا کبھی خیر خواہ اور ہمدرد ہو یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اب دیکھ لو مسلمانوں کے ساتھ اس کی خیر خواہی ادھر تو مسلمانوں کو حکومت کے آگے کر دیا اور ادھر شدھی کا مسئلہ جاری کروا دیا غرض ہر طرح سے مسلمانوں کے جان و مال ایمان، جائیداد، زر، زمین اور مال سب کا مالک اپنی قوم کو بنانا چاہتا ہے۔"(۲)

ایک اور مجلس میں گاندھی کے متعلق فرمایا کہ ایک صاحب اس دھوکے میں مبتلا تھے کہ فلاں طاغوت (گاندھی) توحید کا قائل ہے اور رسالت کے متعلق میری اس سے گفتگو ہوئی

۱۔ اسعد الابرار ۱۳۲

۲۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ۲۶۳

۳۔ الافاضات الیومیہ جلد پنجم ۸۵

تو اس نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ محمد رسول اللہ اللہ کے رسول تھے۔ میں نے کہا کہ ایک تو جاننا ہے اور ایک ماننا ہے۔ نرے جاننے سے کیا ہوتا ہے ماننے سے ہوتا ہے۔ یہ جاننا تو ایسا ہے کہ جیسے قیصر جرمن جانتا تھا کہ جارج پنجم بادشاہ ہے پھر جارج سے لڑا کیوں کیا جاننا کافی ہے۔ جارج کے دل سے پوچھو کہ قیصر کیسا ہے اور قیصر کے دل سے پوچھو کہ جارج کیسا ہے۔ معلوم ہو جائے گا۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ گاندھی کا جاننا ایسا ہی ہے اگر وہ توحید کا قائل ہے حضور کو اللہ کا رسول مانتا ہے تو قبول اسلام کا اعلان کیوں نہیں کرتا نماز کیوں نہیں پڑھتا۔ قربانی گاؤ کیوں نہیں کرتا۔"[1]

ایک اور مجلس میں گاندھی کے متعلق فرمایا "اس زمانے میں ایک طاغوت ہے عقل تو اس کو چھو کر نہیں گئی۔ سارے ملک میں فتنہ و فساد کا تخم بو دیا ہے اور مسلمانوں کی بھولی قوم اس کے مکر و فریب میں آگئی اور اس کو اسلام اور مسلمانوں کا خیر خواہ سمجھ بیٹھی۔ حالانکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کا سخت دشمن ہے۔ متواتر واقعات سے اللہ تعالیٰ نے اس کی دشمنی کو طشت از بام کر دیا ہے۔ اور لوگوں کو واقعی یقین آگیا ہے کہ واقعی نہایت بدنیت مکار اور چالاک شخص ہے۔ غنیمت ہے کہ اب بھی جلدی صبح ہو گئی ہے کہ لوگ اس کے مکر و فریب سے آگاہ ہوئے۔ اب خدا معلوم کس فکر میں ہے۔ شاید کوئی اور روپ بدل کر مسلمانوں کے سامنے آئے۔ جب کبھی پلیٹ فارم پر آتا ہے۔ ایک نیا ڈھونگ بنا کر آتا ہے۔"[2]

۱- الافاضات الیومیہ جلد پنجم ۱۰۲-۱۰۳ ۲- الافاضات الیومیہ جلد ششم ۱۰۶

گاندھی کی اس مسلم کش پالیسی کے متعلق آل انڈیا مسلم لیگ کے لیڈر یامین خاں نے بھی تقریباً انہی خیالات کا اظہار کیا انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح میں لکھا کہ گاندھی کی ہر معاملے میں یہ چال بھی کہ انگریزوں اور مسلمانوں دونوں کو بیوقوف بنانا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کو انگریزوں سے لڑانے میں ماہر تھے۔

ہندو مسلم اتحاد
مولانا تھانوی کی نظر میں

تحریک خلافت کے دوران میں ہندو مسلم اتحاد کے عارضی مظاہرے دیکھنے میں آئے تھے۔ چونکہ مولانا تھانوی کی ہندوؤں اور گاندھی کے متعلق آخری رائے یہ تھی کہ وہ مسلم قوم کے دوست اور ہمدرد نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا آپ کی طرف سے ہندو مسلم اتحاد کی تائید کا سوال خارج از بحث تھا۔ اس لیے آپ نے نہایت سختی کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کے مفروضے کی مذمت فرمائی۔ مولانا کی رائے میں اگر مسلمان خود اپنی اصلاح کر لیں۔ مذہب کا دامن مضبوطی سے تھام لیں تو پھر ان کو کسی سے امداد یا کسی سے اتحاد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس کے متعلق ایک مرتبہ ایک مجلس میں فرمایا کہ "مسلمانوں کی شان اس کے بالکل خلاف ہے کہ وہ دوسری قوموں کی روش اختیار کریں۔ یا ان کی تدابیر کو ذریعہ ترقی بنائیں یا ان سے کسی قسم کی مدد کے خواہاں ہوں۔ بڑی غیرت کی بات ہے ان کو تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ مشروع تدابیر کو اختیار کرنا چاہیے۔ اپنے سلف کے کارناموں کو پیش نظر رکھنا چاہیے"[1] ایک اور مجلس میں فرمایا کہ "کوئی انگریزوں میں گھستا ہے کہ ان کے پاس ہماری فلاح و بہبود کے اسباب ہیں ان کا سا لباس، ان کی سی بول چال ان کی معاشرت اختیار کر لیتا ہے۔ کوئی ہندوؤں کی بغل میں جا گھستا ہے کہ ان کے ساتھ رہنے میں ہماری فلاح و بہبود ہے۔ ان کے ساتھ شریک ہو کر احکام اسلام یہاں تک کو پامال کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ ایمان تک کو قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر رہے کورے کے کورے نہ ہندوؤں نے کچھ دیا نہ انگریزوں نے کچھ دیا۔"[2]

۱- الافاضات الیومیہ جلد پنجم ۲۶-۲۷ ۲- الافاضات الیومیہ جلد پنجم ۲۸

مولانا تھانوی کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتا تھا کہ دونوں قومیں تعداد میں مساوی اور برابر ہوں۔ ایک مولوی صاحب نے اس مسئلے پر آپ سے ایک سوال کیا کہ اگر ہندو مسلم باہم حاکم و محکوم نہ ہوں بلکہ باہمی مساوات ہو تو کیا اس وقت ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام چلا سکتے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ قواعد سے گنجائش تو معلوم ہوتی ہے مگر اس وقت تجربے کی بنیاد پر دیکھا جائے گا کہ اس اشتراک میں کس کا نفع ہے اور کس کا نقصان ہے۔ اگر مسلمانوں اور ہندوؤں کے ہاتھوں میں حکومت آبھی جائے اور تیسری قوم بے دخل ہو جائے تو کامیابی تب بھی ہندوؤں کی ہوگی۔ مسلمانوں کی نہ ہوگی۔ ایک تو ترکیب کے لحاظ سے اور دوسرے ان کی اکثریت کی بناء پر تیسرے ان کے طبائع حالات پر نظر کرکے۔ اور عقلی طور پر مقصود حکومتِ عادلہ کا ہے۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ احتمال ہے ہی نہیں کہ عدل ہو۔ جیسا کہ ہندوؤں کی کارگزاری سے اس وقت تک ظاہر ہے کہ وہ مسلمانوں کو ہندوستان سے مٹانا چاہتے ہیں۔ یہ اپنے دل مذاق سے باز نہ آئیں گے۔ اس کا نتیجہ خوں ریزی اور فساد ہے۔[1]

تحریک خلافت کے دوران مسلمان جس انداز میں گاندھی کی پیروی کر رہے تھے مولانا کے نزدیک وہ ہندوؤں کا تابع بننا تھا نہ کہ یہ ہندو مسلم اتحاد کی کوئی صورت تھی چنانچہ ایک مجلس میں ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا "متعصب ہندوؤں نے مسلمانوں کو قریب قریب عضو معطل بنا رکھا ہے۔ مسلمان چاہتے ہیں کہ اتحاد ہو یہ تابع بننا ہے۔ اتحاد تو اس وقت ہوتا ہے جب دونوں قومیں مساوی ہوں۔ خدا معلوم مسلمان ہندوؤں کے اس قدر گرویدہ کیوں ہوگئے ہیں۔ جن کی نظروں میں گذشتہ واقعات ہیں وہ کبھی اس قوم پر اعتماد نہیں

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد سوم ص ۳۲۹ ۔ ۳۳۰

کر سکتے، مگر آج کل کے نوجوان اس قوم کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ ان کی دوستی کا نتیجہ مسلمانوں کے لیے خطرناک ہوگا۔[1]

قربانی گاؤ

تحریک خلافت کے دوران ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط و پائیدار کرنے کے لیے قربانی گاؤ کا سوال خاص طور سے زیر بحث لایا گیا تھا۔ چند مسلمان لیڈروں اور نیم صحافی علماء نے قرآن مجید اور احادیث نبوی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ گائے کی قربانی ضروری نہیں ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ ہندوؤں کی خوشنودی کی خاطر مسلمان گائے کی بجائے بھیڑ کی قربانی کیا کریں۔ چنانچہ جمعیۃ العلماء ہند کے ۱۹۲۱ء کے اجلاس میں ایک صاحب مولوی فاخر الٰہ آبادی نے ایک قرارداد پیش کی جس میں کہا گیا کہ مسئلہ گاؤ کشی میں ہندوؤں کی دلجوئی کے لیے گائے کی بجائے بھیڑ بکری کی قربانی دی جائے۔[2] ادھر غیر متعصب اور سیکولر گاندھی کے نزدیک "گاؤ رکشا" کا سوال ہندوؤں کے نزدیک بڑی مذہبی اہمیت رکھتا تھا

چونکہ مولانا تھانوی ہندو مسلم اتحاد کے مفروضہ میں یقین نہیں رکھتے تھے اور گائے کی قربانی کو شعائر اسلام میں شمار کرتے تھے اس لیے وہ محض ہندوؤں کی خوشنودی کے لیے کسی بھی شعائر اسلام کو چھوڑنے کا مشورہ نہیں دے سکتے تھے۔ ایک مجلس میں قربانی گاؤ کے مسئلہ پر فرمایا "کہ اگر کسی کی رائے یہ ہو کہ مسلمان گاؤ کشی چھوڑ دیں تو چونکہ اس رائے کی وجہ ملت کفریہ کی رعایت ہے اس لیے ملت کفریہ کے مقابلے میں بالجبر گاؤ کشی اسلام کا شعار ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ گائے کا گوشت کھانے

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد سوم ص ۳۲۰

۲۔ انوار الحسن شیر کوٹی تجلیات عثمانی (نشر المعارف ملتان، ۱۹۵۸) ص ۲۵۲

کو اسلام سے تعلق نہیں حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے شدید تعلق معلوم ہوتا ہے کہ "من صلی صلوتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا" (۱)

ایک دور مجلس میں فرمایا کہ "ہندوؤں کا طریقہ ہے کہ پہلے تو احسان کرتے ہیں اور پھر اپنا کام بناتے ہیں۔ ایک جگہ ہندوؤں نے کئی لاکھ روپیہ جمع کیے اور علماء سے کہا کہ عربی مدرسہ بناؤ اور کہا کہ اس قدر روپیہ قربانی میں صرف ہوتا ہے۔ قربانی موقوف کر دو۔ بعض علماء نے کہا کہ روپیہ لے لو دیکھیے دین پر یہ اثر ہوتا ہے۔ ہمارا مسلک تو یہ ہونا چاہیے کہ اگر دنیا کے تمام خزانے بھی ملیں اور ایک مسئلہ خلاف کرنا پڑے تو خزانے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں" (۲)

مولانا تھانوی کا کہنا تھا کہ چونکہ قربانی شعائر اسلام میں سے ہے جسے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں نے اپنی جان کی قربانی دے کر قائم کیا ہے اس لیے اگر مسلمان ایک شعائر اسلام کو چھوڑنے پر تیار ہو گئے تو دین کی بیخ کنی شروع ہو جائے گی اور ایسا کرنا دوسری قوموں کو اس بات کی دعوت دینا ہو گا کہ سب احکام اسلام ایسے ہی ہیں اس لیے ان کو کسی نہ کسی وجہ سے چھوڑا جا سکتا ہے۔

مولانا نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ اگر ہندوؤں کو خوش کرنے کی خاطر وہ قربانی گاؤ کو ترک کرنے پر آمادگی کا اظہار کریں گے تو پھر کل کو ہندوؤں کا مطالبہ یہ ہو گا کہ کلمہ چھوڑ دو تاکہ دونوں قوموں میں اتفاق اور اتحاد اور بڑھ جائے کیونکہ حقیقت میں تو یہ ساری دشمنی کلمہ پڑھنے کی بدولت ہے (۳)

مولانا تھانوی چونکہ قربانی گاؤ کو شعائر اسلام میں سے سمجھتے تھے اس لیے آپ کے نزدیک

۱۔ کمالات اشرفیہ ص ۱۷۶

۲۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب "حسن العزیز" جلد سوم ص ۱۸۵

۳۔ الافاضات الیومیہ جلد اول ص ۳۲۹

اس کا گوشت کھانا بھی موجب ثواب تھا۔ فرمایا کہ "اس وقت مسلمان کی وقعت تین چیزیں ہیں ایک نماز دوسرے بزرگوں کی محبت تیسرے گائے کا گوشت" (۱)۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی بھی گائے کی قربانی کو شعائر اسلام میں سے سمجھتے تھے۔ آپ نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا "ذبح بقر در ہندوستان از شعائر اسلام است" ذبیحہ گاؤ ہندوستان میں ایک بڑا اسلامی شعار ہے۔ (۲)

ترک موالات

رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کے دوران گاندھی ترک موالات کا نسخہ ایجاد کر چکا تھا سنہ ۱۹۱۹ء کی خلافت کانفرنس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ برطانوی حکومت سے ہر قسم کے تعلقات ختم کر دیے جائیں۔ سرکاری ملازمتیں خصوصاً پولیس، فوج اور وکالت ترک کر دی جائیں۔ اعزازی خطابات واپس کر دیے جائیں۔ کالجوں اور سکولوں کو جو امداد حکومت سے ملتی ہے اسے لینے سے انکار کر دیا جائے اور کچہریوں میں مقدمات درج نہ کرائے جائیں (۳)۔

جمعیۃ العلماء ہند نے بھی ترک موالات کو عین اسلامی قرار دیا اور اپنے اجلاس میں وہ مشہور فتویٰ جاری کیا جس پر ۴۷۴ علماء کے دستخط تھے۔ اس فتویٰ میں کہا گیا کہ "لفظ موالات اصطلاح شرع میں بمعنی محبت و مناصرت اور باہمی امداد کے مستعمل ہوتا ہے۔ اعدائے دین سے باعتبار دونوں معنی کے حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دشمنان اسلام سے موالات رکھنے کو منع فرمایا ہے خواہ وہ ظاہراً ہوں یا باطناً۔ بلا اجرت ہوں یا با اجرت۔ اللہ تعالیٰ نے

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد اول ۳۲۷

۲۔ مکتوبات امام ربانی جلد اول (لکھنؤ ۱۹۱۳ء) مکتوب نمبر ۸۱

۳۔ امین زبیری "سیاست ملیہ" (آگرہ عزیزی پریس ۱۹۴۱ء) ص ۱۵۶

فرمایا ہے کہ جن کافروں نے دین کے معاملے میں تم سے قتال کیا ہے تم کو اپنے ممالک سے نکال دیا ہے اور تمہارے اخراج میں مدد دی ان سے دوستی اور باہمی امداد سے خدا تم کو روکتا ہے اور جو لوگ ایسے کفار سے موالات رکھیں وہ سب ظالم ہیں۔ جو مسلمان باوجود واقفیت اس مسئلہ کے ان سے موالات رکھے سخت گناہگار ہوگا۔ گورنمنٹ ہند کی کونسلوں کی ممبری، پیشہ وکالت، مختار کاری وغیرہ سرکاری یا نیم سرکاری سکولوں میں تعلیم حاصل کرنا یا بچوں کو تعلیم دلانا گورنمنٹ سے تعلیم میں مدد لینا۔ آنریری مجسٹریٹی قبول کرنا خطابات قبول کرنا یہ ساری چیزیں موالات میں داخل ہیں۔"[1]

چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں نے اس فتویٰ کی پیروی میں سرکاری ملازمتیں ترک کردیں اعزازات واپس کردیے مسلمان طلبا نے سرکاری امداد سے چلنے والے سکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کیا۔

ترکِ ملازمت کے سلسلے میں مولانا تھانوی کا خیال یہ تھا کہ ملازمت ترک نہیں کرنی چاہیے۔ اس سے طرح طرح کی پریشانیاں اور مشکلات پیدا ہوں گی۔ اور معلوم نہیں انسان ان پریشانیوں اور مشکلات کا مقابلہ کرسکتا ہے یا نہیں۔[2]

مولانا کی رائے میں اگر کوئی شخص ایسی ملازمت کر رہا ہے جو "ناجائز ملازمت" کے زمرے میں آتی ہے تو اس کو یک لخت نوکری چھوڑنی نہیں چاہیے۔ بلکہ کسی اور ذریعہ معاش کی فکر میں رہے اور کوئی حلال ذریعہ معاش میسر آجائے تو ناجائز نوکری فوراً چھوڑ دے کیونکہ ناجائز نوکری میں تو ایک ہی بلا میں مبتلا ہے جب نوکری چھوڑے گا تو سیکڑوں

۱۔ تحفۂ فیصلہ علمائے ہند، مطبع ہاشمی میرٹھ سن ندارد، ص ۷ تا ۹

۲۔ الافاضات الیومیہ جلد پنجم ۲۱

بلاؤں میں مبتلا ہو جائے گا۔[1]

مولانا تھانوی سے تحریک کے دوران میں یہ فتویٰ طلب کیا گیا کہ "آیا ناجائز نوکریاں چھوڑ دی جائیں چاہے ذرائع معاش کے فقدان سے تنگی ہی کیوں نہ ہو۔ مولانا نے جواب میں فرمایا کہ "یہ تقاضہ بعض اوقات ترکِ واجب تک پہنچ جاتا ہے مثلاً کسی کے پاس بجز ناجائز نوکری کے یا خاص تجارت کے دوسرا ذریعہ معاش نہیں اور ادائے حقوق اہل و عیال کے لیے اس پر اکتساب واجب ہے تو اس تقاضہ سے اس واجب کا ترک لازم آتا ہے اور ترکِ واجب موجب معصیت ہے۔"[2]

جب مسلمانوں نے ترکِ موالات کے فتویٰ پر عمل کرتے ہوئے سرکاری ملازمتیں چھوڑنی شروع کیں تو ہندوؤں نے انہی ملازمتوں کو پُر کرنا شروع کر دیا۔ اس سے مسلمانوں کو سخت معاشی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس بنا پر مولانا تھانوی نے ترکِ ملازمت کو ناپسند فرمایا اور ایسے لوگوں کو "کم فہم" اور "کم عقل" قرار دیا۔[3] ایک سرکاری ملازم جنہوں نے ترکِ موالات کی حمایت میں ملازمت سے استعفےٰ دے دیا تھا۔ مولانا کو ایک خط کے ذریعے اپنی معاشی مشکلات سے آگاہ کیا۔ اس پر مولانا نے فرمایا کہ "یہ صاحب سرکاری ملازم تھے۔ اس تحریک کے سبب مستعفی ہو گئے۔ ملازمت تلاش کرتے ہیں مگر ملتی نہیں پریشان ہیں۔ دین اور دنیا دونوں خراب ہوئے۔ اس کانگرس کی وجہ سے ہر شخص پریشان ہے۔"[4]

۱۔ کمالات اشرفیہ ص ۲۲۳

۲۔ افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص ۲۶-۲۷ (دیوبند ۱۳۶۵)

۳۔ الافاضات الیومیہ جلد اول ص ۹۱

۴۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص ۱۸۰

ترکِ موالات کو مؤثر بنانے کے لیے بھوک ہڑتال، جلسوں اور احتجاج وغیرہ کے طریقے اختیار کیے گئے۔ مولانا تھانوی نے ان تمام امور کے متعلق بھی اپنی رائے کا واضح طور پر اظہار فرمایا۔ آپ نے ایک صاحب کے دریافت کرنے پر بھوک ہڑتال کو "خودکشی اور حرام موت" کا نام دیا۔ ایک مجلس میں فرمایا کہ "آج کل بہادری کی ایک نئی قسم نکلی ہے مار کھانا، ذلیل ہونا، بھوک ہڑتال کرنا، یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ حکومت مل جائے۔ ایسے کم حوصلہ لوگوں کو تو حکومت کا نام بھی نہیں لینا چاہیے"۔[1]

جو لوگ اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرتے ان کے متعلق ایک صاحب نے مولانا کی مجلس میں کہا کہ جو لوگ اس تحریک میں کام کرتے ہیں وہ گرفتاری کو اپنے لیے باعث فخر و عزت سمجھتے ہیں۔ اس پر مولانا تھانوی نے فرمایا کہ "جی ہاں یہ سمجھنا ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک سرحدی ہندوستان آیا اور شہر میں کسی حلوائی کی دکان سے حلوہ اٹھا کر کھا گیا۔ اس پر اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ حاکم نے دیکھا کہ نووارد ہے اور حرکت بھی معمولی سی کی ہے حکم دیا کہ اس کو گدھے پر سوار کرا کر لڑکوں کو کوئی بجانے والی چیز دے کر سارے شہر کا گشت کروایا جائے۔ ایسا ہی کیا گیا جب یہ سرحدی وطن واپس پہنچا تو لوگوں نے دریافت کیا کہ آغا ہندوستان رفتہ بودی آں چگونہ ملک است۔ تو یہ سرحدی کہتا ہے ہندوستان ملک خوب است حلوہ خوردن مفت است، سواری خر مفت است فوج طفلاں مفت است ڈم ڈم مفت است۔ غرض کہ جس قدر اسباب ان کی ذلت کے جمع کیے گئے تھے اس کو انہوں نے اپنے لیے باعث عزت و فخر سمجھا۔ یہی حالت آج کل کے لوگوں کی ہے۔ خدا معلوم

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص ۵۰۱

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد سوئم ص ۱۲۵

کہ ان کی عقلوں کو کیا ہوا ہے"۔[1]

تحریکِ ہجرت کے بارے میں مولانا تھانوی کی رائے

تحریکِ خلافت کے دوران مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی طرف سے ہجرت کے فتاویٰ جاری کیے گئے۔ اس سے پیشتر مولانا محمد علی اور شوکت علی نے لارڈ چمسفورڈ کو ایک میمورنڈم اپریل ۱۹۱۹ء میں پیش کیا جس میں کہا گیا کہ کوئی بھی ایسی سرزمین جو اسلام کے لیے محفوظ نہ رہے تو ایسی صورت میں مسلمانوں کے لیے دو ہی راستے باقی رہ جاتے ہیں، اول جہاد دوئم ہجرت۔ چونکہ ہماری پوزیشن بہت کمزور ہے اس لیے ہمارے لیے ہجرت کا راستہ ہی باقی رہ جاتا ہے۔[2] اگرچہ یہ کوئی فتاویٰ تو نہ تھا لیکن اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ حالات نے مسلمانوں میں اس نوع کی سوچ بھی پیدا کر دی تھی۔ باقاعدہ فتویٰ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالباری کی طرف سے جاری ہوئے۔ مولانا ابوالکلام نے اگرچہ جو فتویٰ جاری کیا۔ اس میں مسلمانانِ ہند کے لیے جنگِ اول کے بعد ہجرت کو واجب قرار دیا لیکن انفرادی ہجرت کو شرعی طور پر غیر صحیح بتلایا۔ دوسرے ہر شخص کے لیے ہجرت کو غیر ضروری بتلایا گیا۔ چونکہ ہندوستان سے ہر شخص ہجرت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے فتویٰ میں کہا گیا کہ جو اشخاص ہندوستان میں مقیم رہیں ان پر انگریزوں سے ترکِ موالات لازم ہوگا۔[3]

مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نزدیک ہندوستان دارالحرب نہیں تھا۔ اس لیے ہجرت سے متعلق جو فتویٰ انہوں نے جاری کیا اس سے کسی بات کی وضاحت نہیں ہوتی۔ مولانا

۳۔ غلام رسول مہر، تبرکاتِ آزاد (کتاب منزل سن ندارد) ص ۲۰۳-۲۰۶

۲۔ نعیم قریشی کا مضمون (ماڈرن ایشین سٹڈیز ۱۹۷۹ء) ص ۴۴

عبدالباری نے ایک مضمون میں جو کہ اخبار "وکیل" امرتسر میں شائع ہوا۔ یہ لکھا کہ ہندوستان دارالاسلام ہے اس لیے ہجرت فرض نہیں اس پر حکیم ابوتراب محمد عبدالحق نے روزنامہ "پیسہ اخبار" میں ایک خط میں مولانا عبدالباری کے دلائل کو غلط بتلاتے ہوئے شاہ عبدالعزیز اور مولانا عبدالحیٔ لکھنوی کے فتاویٰ کا ذکر کیا جن کے نزدیک ہندوستان دارالاسلام نہیں رہا تھا۔ حکیم ابوتراب کے نزدیک چونکہ مسلمان ہندوستان میں رہ کر دوسرے ممالک کے مسلمانوں کی مدد نہیں کر سکتے تھے اس لیے ہجرت لازمی تھی۔[1] اس پر مولانا عبدالباری کا ایک خط اسی اخبار میں شائع ہوا جس میں انہوں نے لکھا کہ "میں ہندوستان کو اصلاً دارالاسلام سمجھتا ہوں اگرچہ حکومت کو ذمی یا معاہد نہیں بلکہ متسلط سمجھتا ہوں۔ اس صورت میں بظاہر دارالحرب کے احکام جاری ہوتے ہیں"۔ مولانا نے اس بات کی بھی تصریح کی کہ "میرے نزدیک ہجرت فرض عین نہیں ہے اور نہ مقصود بالذات بلکہ فرض دفاع کے لیے کی جا سکتی ہے"۔ ساتھ ہی اس خط میں مولانا نے یہ بھی لکھ دیا کہ "اس وقت جو لوگ ہجرت کرنا چاہتے ہیں انہیں روکنے کا کوئی حق نہیں اور جو نہیں کرتے خدا نے ان پہ جبر نہیں کیا"۔ مولانا خود ذاتی طور پر ہجرت کرنا چاہتے تھے مگر ان کے مشیروں نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔[2]

ایک اور مضمون میں مولانا عبدالباری نے جن خیالات کا اظہار کیا ان سے دونوں فریقوں کی حمایت ظاہر ہوتی ہے۔ آپ نے شاہ عبدالعزیز کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ ہر دارالحرب میں ہجرت فرض نہیں لیکن اس کے باوجود اگر ہندوستان بالفرض دارالحرب ہو تب بھی ہجرت کی فرضیت ہر صورت میں نہیں ہو سکتی۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ فرض دفاع کے انجام دینے

۱۔ روزنامہ پیسہ اخبار (لاہور) ۱۲ مئی ۱۹۲۰ء ص ۱

۲۔ ایضاً ۱۹ مئی ۱۹۲۰ء ص ۲

کے لیے میں ہجرت کا حکم دیتا ہوں۔ اس مضمون میں بھی آپ نے یہ لکھا کہ میرا ارادہ خود ہجرت کا تھا مگر مشورہ سے روک دیا گیا۔[1] یہ صورت حال اتنی دلچسپ ہو گئی کہ عزیز ہندی نے مولانا کو ایک تار بھیجا جس میں ان سے استدعا کی گئی کہ وہ اپنے خیالات کا واضح طور پر اظہار فرما دیں۔[2]

اس فتویٰ نے اپنا اثر دکھایا اور ہزاروں مسلمان اپنی جائیدادیں فروخت کر کے افغانستان کی طرف روانہ ہونے لگے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اگست ۱۹۲۰ء تک چالیس ہزار مسلمان افغانستان میں داخل ہو چکے تھے۔ جب ہجرت کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا تو افغانستان کی حکومت نے داخلہ پر پابندی لگا دی اور مسلمانوں کو واپس ہندوستان لوٹنا پڑا۔ بقول سید حسن ریاض "یہی ایک قدم تھا جو مسلمانوں نے بغیر سوچے سمجھے کیا"۔[3]

صوبہ سندھ سے جہاں کے مسلمانوں نے تحریک ہجرت میں بڑے جوش و خروش اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ عین تحریک ہجرت کے دوران ایک شخص نے مولانا تھانوی سے ہجرت کے بارے میں فتویٰ دریافت کیا۔ خط میں سائل نے اس بات کا ذکر خاص طور پر کیا کہ "لوگوں کا خیال ہے کہ آپ اس خط کا جواب نہیں دیں گے"۔ مولانا تھانوی نے ہجرت کے متعلق فتویٰ دیا کہ "شریعت نے وجوب ہجرت کے لیے جو شرائط عائد کی ہیں وہ شرائط اب بھی موجود نہیں ہیں"۔ اس تحریر کی جو کہ ایک فتویٰ کی شکل میں موجود ہے قابل ذکر بات یہ ہے کہ آپ نے اس فتویٰ کی عبارت عربی زبان میں لکھی حالانکہ سوال کنندہ نے خط

۱۔ روزنامہ پیسہ اخبار ۲۳ جون ۱۹۲۰ء ص ۳-۴

۲۔ The Ulema in Politics p.265.

۳۔ پاکستان ناگزیر تھا ص ۱۰۳

اردو زبان میں لکھا تھا۔ اس معاملے میں جو حکمت پوشیدہ تھی[1] اس کے متعلق مفتی محمد شفیع نے راقم کے استفسار کے جواب میں لکھا کہ "حضرت کی خصوصیات میں سے تھا کہ ہر ضروری سوال کا جواب تو دیتے ہی تھے مگر اس کی بھی رعایت رہتی تھی کہ کسی فتنہ یا اپنے لیے بےضرورت کسی ابتلاء کا موجب نہ ہو۔ ایسی صورت میں عموماً جواب عربی زبان میں لکھ دیتے تھے کہ مخاطب تو کسی سے پڑھوا کر مطلب سمجھ لے گا مگر اس کو اخبار وغیرہ میں شائع کرکے غلط تاثر پیدا نہ کر سکے گا۔ اس معاملہ میں بھی یہی حکمت تھی۔"

تحریک ہجرت کے سبب مسلمانوں کو جو تکالیف اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا تھانوی کو اس سے سخت صدمہ پہنچا۔ اس لیے آپ نے بارہا اپنی مجالس میں ان لوگوں پر کڑی نکتہ چینی کی جنہوں نے تحریک ہجرت کے لیے لوگوں کو آمادہ کیا۔ ایک مجلس میں فرمایا کہ "تحریک خلافت کے دنوں میں ہجرت کا ریزولیوشن پاس کرا دیا۔ اس پر مسلمان لبیک کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہزاروں مسلمانوں کو بے خانماں کروا دیا"۔ مولانا تھانوی ہجرت کو گاندھی کا سبق کہا کرتے تھے[2] اور ہجرت کے فتاویٰ جاری کرنے والے حضرات پر سخت ناراضگی اور غصے کا اظہار کرتے۔

۱۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ تحریک ہجرت کے دوران صوبہ سرحد کے ہندوؤں نے مسلمانوں کو ہجرت پر آمادہ کیا کیونکہ ان کی نظریں مسلمانوں کی زمینوں پر تھیں۔ جب غریب مہاجرین نے افغانستان کا رخ کیا تو ہندوؤں نے دس دس ہزار مالیت کی زمین سو روپے تک میں خرید لیں۔ اسی طرح ۲۰۰ روپے کا بیل ۱۰ روپے میں خرید لیا گیا۔ دیکھیں نعیم قریشی کا مضمون ص ۵۵

۲۔ الافاضات الیومیہ، جلد اول ص ۹۲

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی کی مانند مولانا احمد رضا خان (۱۸۵۶-۱۹۲۱) مولانا عبدالرؤف دانا پوری (۱۸۷۶-۱۹۴۸) پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف (۱۸۵۹-۱۹۳۹) اور مولانا اسحٰق مانسہروی کے علاوہ متعدد سیاسی زعماء مثلاً علامہ اقبال، قائداعظم، مولانا حسرت موہانی اور ڈاکٹر انصاری نے تحریک ہجرت کو ناپسند کیا تھا۔[1] حکیم اجمل خان جو کہ تحریک خلافت کے صف اول کے زعماء میں سے تھے۔ تحریک ہجرت سے مطمئن نہ تھے کیونکہ ان کے بقول "ترک وطن کی تحریک ہر طرح سے وطن پرستی کے مفہوم کی نفی تھی" ان کی رائے میں "آزادی کی جنگ وطن ہی کی سرزمین پر لڑی جانی چاہیے"[2]

کانگرس کے سرکاری مورخ سیتارامیہ نے تحریک ہجرت کو غیر دانشمندانہ تحریک کا نام دیا۔[3] ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے بھی تحریک کے بارے میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ "تحریک میں تعمیری نتائج پیدا کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں تھی۔ اس کے نتیجے میں صرف یہ ہوا کہ ان پرجوش اور مخلص اشخاص کو جنہوں نے اس تحریک کی دعوت پر لبیک کہا شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑا"[4]

موپلا بغاوت

مالابار کے علاقے میں موپلا نامی ایک قوم آباد تھی۔ موپلے عربی النسل اور نہایت پرجوش اور پکے مذہبی قسم کے لوگ تھے۔ چونکہ وہ مذہب کے نام پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے

۲۔ قاضی عبدالغفار، حیات اجمل (علی گڑھ ۱۹۵۰ء) ص ۲۲۲

۳۔ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ص ۳۸۷

4. History of the National Congress p.199.

ہر وقت تیار رہتے تھے لہٰذا گورنمنٹ ڈرتی تھی کہ یہ قوم تحریکِ خلافت کے اثر میں نہ آجائے چنانچہ جب چند لیڈروں نے مالابار آنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ان کے داخلے پہ پابندی عائد کر دی بعد میں حکومت نے یعقوب حسن کو پالامیشن اور کوپا کو گرفتار کر لیا۔ حکومت کی اس کارروائی سے حالات سدھرنے کی بجائے مزید بگڑ گئے۔ دفعہ ۱۴۴ نافذ کرنا پڑی۔ خلافت والنٹیروں کی وردیاں چھین لی گئیں۔ موپلوں نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو وہ جوش میں آگئے اور صورتِ حال اس حد تک سنگین ہو گئی کہ مارشل لاء لگانا پڑا۔ ہزاروں موپلوں کو قتل کر کے ان کے مکانات اور کھیتوں کو آگ لگا دی گئی۔ موپلے چونکہ نہتے تھے اس لیے انہوں نے گوریلا جنگ اختیار کی۔ ادھر انگریزوں نے ہندوؤں کو موپلوں کی جاسوسی پہ مقرر کر دیا جس کی وجہ سے موپلوں نے نہ صرف انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے بلکہ ہندو بھی اس کی زد میں آگئے۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ہندو زندگی کے ہر شعبہ میں چھائے ہوئے تھے۔ اور یہ مظالم انہیں کے ہاتھوں ہی ہوئے تھے اس لیے قدرتی طور پر ہندو بھی موپلوں کے ردِ عمل کا نشانہ بنے۔

اس تمام واقعہ میں موپلوں کو سخت جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ مولانا تھانوی کو اس کا سخت صدمہ اور افسوس تھا کہ موپلوں کو جوشیلی تقریروں نے تباہ و برباد کر دیا اپنے دکھ اور رنج کا اظہار کرتے ہوئے آپ نے ایک مجلس میں فرمایا کہ "مالابار میں لیڈروں نے اشتعال انگیز اور جوشیلی تقریریں کیں اور موپلوں کی قوم کو بھڑکا دیا جو شیلی اور غیور قوم تھی ویسے بھی عربی النسل تھے کیا نتیجہ نکلا۔ جو کچھ ہوا سب کو معلوم ہے۔ تباہ و برباد ہو گئے۔ ہزاروں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے۔ بہت سے لوگ اب تک جیلوں میں پڑے سڑ رہے ہیں نہ کوئی اصول ہے نہ کوئی قاعدہ جب موپلوں پر مصیبت پڑی تو کوئی بھی لیڈر وہاں نہ گیا سب گیدڑ بن گئے۔ جب موپلوں کی تباہی کا نقشہ سامنے آتا ہے اس قدر دل دکھتا ہے جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی تمام ذمہ داری ان بے عقل اور بدفہم لیڈروں پر ہی ہے"[1]

تحریکِ خلافت کے سلسلے میں مناظرے

چونکہ مولانا تھانوی نے تحریک سے علیحدگی اختیار کر رکھی تھی۔ اس لیے بہت سے لوگوں نے آپ سے اس بارے میں گفتگو کی غرض سے تھانہ بھون آنے کی اجازت چاہی۔ ایک مولوی صاحب نے جو تحریک کے سرگرم کارکنوں میں سے تھے تھانہ بھون آنے کی خواہش ظاہر کی۔ مولانا تھانوی نے ان صاحب سے ملنے پہ رضامندی کا اظہار کیا۔ تھانہ بھون پہنچنے پر مولوی صاحب نے درخواست کی کہ میں تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں مولانا تھانوی نے اس خواہش پر فرمایا کہ "جلوت میں گفتگو سے تو آپ کے لیے خطرہ ہے کہ آپ کے اسرار ظاہر ہوں گے اور خلوت میں میرے لیے خطرہ ہے کہ مجھ پر اشتباہ ہو گا۔ اس لیے جو کچھ کہنا ہو جلوت میں کہیں"۔

تحریک کے دوران مولانا تھانوی کو کیرانہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کے ایک مولوی صاحب بڑی سرگرمی سے تحریک میں حصہ لے رہے تھے وہ مولوی صاحب جو کہ منطقی اور معقولی آدمی تھے مولانا تھانوی سے ملنے آئے اور آپ سے تحریک کے بارے میں ایک سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ پہلے آپ میرے ایک سوال کا جواب دیں کہ منطقی قاعدہ ہے کہ خسیس اور نفیس کا مجموعہ خسیس ہوتا ہے انہوں نے کہا کہ بالکل صحیح ہے مولانا تھانوی نے دریافت کیا کہ اب جو جماعت مسلم اور غیر مسلم سے مرکب ہو وہ کافر ہو گی یا مسلم۔ کہا کافر ہو گی

۱۔ الافاضات الیومیہ۔ جلد ششم، ۱۵۳

مولانا تھانوی نے فرمایا کہ ترکی میں جمہوریت قائم ہو چکی ہے اور خلافت ختم کر دی گئی ہے اور وہ مرکب ہے مسلم اور غیر مسلم سے اب وہ سلطنت اسلامی ہے یا غیر اسلامی انہوں نے کہا کہ ایسی سلطنت غیر اسلامی ہوگی۔ اس پر مولانا تھانوی نے فرمایا کہ جب شرعی اصول سے وہ اسلامی سلطنت بھی ثابت نہ ہوئی تو پھر خلافت تو بہت بڑی چیز ہے۔ اس کی حمایت کیسی۔ اس پر تو وہ مولوی صاحب بہت بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ واقعی اس کی نصرت تو جائز نہیں۔ اس پر مولانا تھانوی نے فرمایا "تم نے تو اتنی جلدی فتویٰ دے دیا حالانکہ تم حامی ہو اور ہمیں مخالف سمجھا جاتا ہے۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ نصرت واجب ہے باوجودیکہ ترکی اسلامی سلطنت نہیں ہے۔ ترکی کی حمایت اور نصرت کی وجہ یہ ہے کہ غیر مسلم حکومتیں اس کو مسلم سمجھ کر مقابلہ کرتی ہیں۔ اب اگر اس کو شکست ہوگی تو مسلمانوں اور اسلام کو شکست سمجھی جائے گی۔"[1]

مولانا تھانوی پر الزامات

تحریک خلافت سے علیحدگی اختیار کرنے کے سبب مولانا تھانوی پر بے شمار الزامات عائد کئے گئے۔ ایک الزام یہ لگایا گیا کہ انگریزوں کے ساتھی ہیں اور گورنمنٹ سے تنخواہ پاتے ہیں۔ اس الزام کے متعلق مولانا نے فرمایا کہ "اس کا مطلب تو ہے کہ اگر میں ۶۰۰ روپے گورنمنٹ سے پاتا ہوں تو طمع ہے خوف نہیں ہے تو اگر طمع کی یہ حالت ہے تو تم ۹۰۰ روپے دے کر اپنے موافق کر لو اگر قبول کر لوں تو صحیح ہے ورنہ غلط"[2]

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد ششم ص ۱۰۳

۲۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص ۶۹۸

تحریک سے اختلاف کے سبب مولانا پر ایک الزام یہ عائد کیا گیا کہ آپ عیسائیوں سے مل گئے ہیں لیکن اس وقت کے سمجھدار لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ شخص عیسائیت کا مخالف ہے۔ مولانا تھانوی کے بھائی پر فالج کا حملہ ہوا تو وہ علاج کروانے کے لیے ایک عیسائی کے پاس مسوری گئے۔ مولانا کے برادر زادہ سے ایک عیسائی کی راہ و رسم ہو گئی۔ اس پادری نے اس تحریک کے متعلق مولانا کے خیالات دریافت کئے۔ آپ کے برادر زادہ نے بتلایا کہ وہ تو اس تحریک سے اختلاف کرتا ہے۔ اس پادری نے یہ معلوم کر کے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص عیسائیت کا دشمن ہے۔ انہوں نے کہا لوگ تو انہیں تحریک میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے عیسائیوں کا دوست سمجھتے ہیں۔ اس پر اس پادری نے کہا کہ اس وقت ہندوستان میں دو مذہب آباد ہیں ہندو اور مسلمان اور اپنے اپنے مذہب کی وجہ سے ایک دوسرے کے سخت خلاف ہیں۔ اس کشمکش کی وجہ سے ہر مذہب کا شخص اپنے مذہب پر سختی سے قائم ہے ان میں تیسرے مذہب کے قبول کی کوئی گنجائش نہیں۔ عیسائی مشن پر لاکھوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے مگر آج تک ہندوستان میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس سوراج کی کوشش میں ملک کے معاملات میں ایک دوسرے کی رعایت کریں گے تو ہر ایک میں ڈھیلا پن پیدا ہو جائے گا اور تیسرے مذہب کی گنجائش پیدا ہو جائے گی کیونکہ آج کل کی عیسائیت کا پہلا زینہ لامذہبیت ہے۔[1]

مولانا تھانوی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے جو اپنا مسلک اور مشرب عدم مخالفت رکھا تو اس کا مقصد اپنے مذہب کا تحفظ اور اپنی قوم کی فلاح و بہبود تھا۔ انگریزوں سے دوستی کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہم انگریزوں کے نہ معتقد ہیں اور نہ محب۔ اپنی مصلحت کی وجہ سے ان کی مخالفت مناسب نہیں سمجھتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہم انگریزوں کے دوست نہیں اپنے

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد ششم ص ۱۰۱

دوست ہیں۔ جہاں انگریزوں کو معلوم ہے کہ ہماری مخالفت نہیں کرتا وہ یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ ہم سے تعلق بھی نہیں رکھتا۔ بعض بدفہم مسلمان مجھ کو بدنام کرتے ہیں کہ انگریزوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ارے عقل کے دشمنو انگریزوں سے کیا تعلق ہوتا تعلق تو تم سے ہے۔ میں نے جو اپنا مسلک اور مشرب عدم مخالفت پر رکھا ہے تو اس میں اپنے دین کی حفاظت کی اور اپنی قوم کی حفاظت کی۔ کانپور میں مچھلی بازار مسجد پر فساد ہوا تھا۔ معزز مسلمانوں کے مشورے سے ایک فیصلہ مرتب کیا گیا۔ اس فیصلہ سے متعلق میری بھی رائے پوچھی گئی تھی۔ میں نے صاف لکھ دیا کہ یہ فیصلہ اسلام کے خلاف ہے۔ اس لیے میری رائے اس کے خلاف ہے جو انسپکٹر میری تحقیق رائے کو آیا وہ کہنے لگا کہ اس فیصلے کو غلط بتلانا بہت سخت بات ہے۔ میں نے کہا سخت ہوا کرے رائے تو وہی ظاہر کی جائے گی جو شریعت کا حکم ہے۔ ان کی حکومت ہمارے ہاتھوں پیروں پر ہے قلب پر نہیں۔ ہم حق کو واضح کرنے میں ان کی کوئی رعایت نہیں کریں گے۔"[1] ایک اور مجلس میں فرمایا "بعض لوگ تحریکات سے علیحدہ رہنے سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم انگریزوں کے دوست ہیں یہ علیحدگی انگریزوں کے ساتھ دوستی نہیں اپنے ساتھ دوستی ہے"[2]

تحریک خلافت میں حصہ نہ لینے پر مولانا پر "موالاتی" کا لیبل چسپاں کر دیا گیا۔ اس الزام کا جواب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "ہم کو موالاتی بتلایا جاتا ہے حالانکہ ہم آج تک انگریزوں سے نہیں ملے اور یہ غیر موالاتی کہلاتے ہیں۔ شب و روز ان سے خلا ملا ہے۔ تعلیم بھی حاصل کی تو انگریزی، شکل و صورت، طرز معاشرت، اٹھنا بیٹھنا، بولنا چالنا سب انگریزی یہ

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد ششم ص ۲۳۹

۲۔ الافاضات الیومیہ جلد پنجم ص ۱۸۷

عجیب ترک موالات ہے۔"[1] ایک اور مجلس میں فرمایا "میں تو کہا کرتا ہوں کہ ہم لوگ موالاتی کہلاتے ہیں۔ مگر بفضل تعالیٰ ہم تو اس حالت میں بھی تارکِ موالات رہے اور عدالتوں میں جانا کسی طور پسند نہ کیا۔ یہ تو زبان سے کہتے ہیں کہ عدالتوں کا بائیکاٹ کرو اور پھر عدالتوں میں جا کر مقدمات کی پیروی بھی کرتے ہیں"[2]

ایک اور مجلس میں فرمایا "ہر شخص کی رفتار، گفتار اور لباس سے انگریزیت جھلکتی ہے سادگی کا نام تک نہیں رہا۔ زبان سے نصرانیت اور انگریزوں کی برائی کرتے ہیں اور دل میں وہی باتیں رچی ہوتی ہیں۔ ان ہی جیسا لباس ان ہی جیسی باتیں۔ ویسی ہی معاشرت اختیار کر رکھی ہے مجھے تو ایک عالم کا قول پسند آیا کہ یہ لوگ نصرانیوں کے تو مخالف ہیں مگر نصرانیت کے حامی ہیں"۔[3]

نواب صدر یار جنگ نے بھی ۲۷ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو سٹریچی ہال میں تقریر کرتے ہوئے مولانا تھانوی سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار فرمایا کہ "ہم سے کہا جاتا ہے تحریک موالات کرو۔ ترکِ موالات کا فتویٰ کون دیتا ہے گاندھی۔ کیا اسلام وہ سادہ مذہب ہے جس کو ہم ایک مشرک سے سیکھیں۔ کہا جاتا ہے کہ ترکِ موالات کرو مگر ہماری صورت ہمارا طرزِ کلام، نشست و برخاست کھانا پینا موالات کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ اگر ہمارے دل میں مذہب کا سچا جذبہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ ہم اپنی صورتیں سیرتیں اس کی ہدایت کے مطابق نہ رکھتے۔"[4]

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص ۱۰۱

۲۔ جمیل احمد شروانی القول الجلیل (سہارن پور سن ندارد) ص ۹۷

۳۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص ۲۶۵

۴۔ نواب صدر یار جنگ ص ۱۷۰

مولانا پر ایک الزام یہ بھی عائد کیا گیا کہ چونکہ ان کے چھوٹے بھائی سی آئی ڈی میں ہیں اس لیے انہوں نے حکومت سے ڈرا رکھا ہے۔ اس الزام کے متعلق خود ہی فرمایا کہ کسی کو کیا خبر کہ وہ تو خود ہی ڈرتے ہیں تو مجھ کو کیا ڈراتے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اپنے ضروری مصالح پر نظر کر کے اگر کوئی خطرات سے احتیاط کرے اور اہل قدرت سے ڈرے تو وہ ایسا ہے کہ جیسے سب شیر سے ڈرتے ہیں۔ میرے متعلق یہ کہنا کہ میں گورنمنٹ سے ڈرتا ہوں بھائی میں تو سانپ سے بھی ڈرتا ہوں۔ بچھو سے بھی ڈرتا ہوں حتیٰ کہ بھڑ اور پسو سے بھی ڈرتا ہوں۔ جتنی موذی چیزیں ہیں سب سے ڈرتا ہوں تو حکام سے ڈرنے کے کیا معنی"۔[۱]

مولانا پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ آپ کو حس نہیں اس لیے خاموش بیٹھے ہیں۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ تحریک سے علیحدگی کا سبب بے حسی نہیں بلکہ حس ہی ہے اور جو تم کو معلوم ہے وہ ہم کو بھی معلوم ہے اور تم سے ایک بات زائد ہم کو معلوم ہے جس کی وجہ سے ہم خاموش ہیں کہ بدون قوت کے مقابلہ کرنے میں ہم فنا ہو جائیں گے کیونکہ ان تحریکات کا نتیجہ ظاہراً ہندوؤں کا غلبہ ہے۔ اور ہندو انگریز سے زیادہ مسلمان کا دشمن ہے"۔[۲]

لیکن اس کے باوجود آپ کو تحریک سے کوئی ضد نہیں تھی۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی بھنگی کا بچہ بھی سمجھا دے گا تو سمجھ میں آجانے کے بعد تحریک میں شامل ہو جاؤں گا۔

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد دوئم ۱۳۹

۲۔ الافاضات الیومیہ جلد سوئم ۳۲۰

تحریکِ خلافت کے مسلمان لیڈر اور مولانا تھانوی

مولانا تھانوی اور مولانا محمود حسن

مولانا محمود حسن اور مولانا تھانوی کا آپس میں استاد شاگرد کا رشتہ تھا۔ مولانا تھانوی نے اپنے استادِ گرامی حضرت شیخ الہند کی سوانح ذکرِ محمود حسن عقیدت سے لکھی اس سے دونوں کے تعلقات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اگرچہ دونوں مذہبی رہنما ایک ہی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے لیکن تحریکِ خلافت کے متعلق دونوں کا مسلک مختلف تھا۔ ایک مرتبہ خود مولانا تھانوی نے فرمایا "سبحان اللہ حضرت دیوبندی (حضرت محمود حسن) کی عالی ہمتی قابلِ دید ہے میرا مسلک تو حضرت کے مسلک سے ظاہراً مختلف تھا ڈھکا چھپا نہ تھا مگر حضرت ذرا بھی دلگیر نہ ہوئے"۔[۱]

لیکن ان اختلافات نے دونوں کے باہمی تعلقات اور ایک دوسرے کے احترام میں ذرہ برابر بھی کمی نہ ہونے دی۔ اس کا اندازہ مولانا تھانوی کے ملفوظات پر ایک نظر ڈالنے سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ تحریکِ خلافت کے دوران بعض لوگوں نے یہ مشہور کر دیا کہ مولانا تھانوی اپنے استاد مولانا محمود حسن کے مخالف ہو گئے۔ مولانا تھانوی کو جب اس افواہ کا علم ہوا تو آپ نے اس کی پرزور تردید کرتے ہوئے اپنے رسالہ النور میں لکھا "اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ یہ تمام باتیں غلط ہیں۔ نہ حضرت اقدس سے مجھے یا میرے کسی متعلق کو مخالفت ہے۔ نہ میں حضرت کا نعوذ باللہ مخالف ہوں۔ بلکہ جس قدر محبت، عظمت حضرت اقدس

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد دوئم ۲۲۰

کہ میرے دل میں ہے اس کو خدا بہتر جانتا ہے۔ مجھ پر حضرت کی مخالفت کا الزام سراسر بہتان ہے۔"[1]

مولانا محمود حسن عام طور پر شیخ الہند کے لقب سے پہچانے جاتے تھے لیکن مولانا تھانوی آپ کو ہمیشہ شیخ العالم اور شیخ الاسلام کے القاب سے یاد فرماتے تھے۔ ایک مجلس میں فرمایا "تم بڑے فخر سے کہتے ہو کہ اسیر مالٹا تھے ہم کہتے ہیں کہ امیر مالٹا تھے۔ تم کہتے ہو کہ شیخ الہند تھے ہم کہتے ہیں کہ شیخ العالم تھے۔ اب بتاؤ مولانا کا زیادہ معتقد کون ہے۔"[2]

مولانا تھانوی کے نزدیک شیخ الاسلام کو شیخ الہند کہنا مولانا کی تنقیص کے برابر تھا۔ ایک مجلس میں اس سلسلے میں فرمایا کہ "جب کوئی حضرت مولانا محمود حسن کو شیخ الہند کہتا ہے تو میرے دل پر پتھر سا لگتا ہے کیونکہ شیخ الاسلام کو شیخ الہند کہتے ہیں۔ بہت برا معلوم ہوتا ہے اس میں حضرت کی تنقیص معلوم ہوتی ہے۔ ان مدعیان محبت نے ہمارے حضرت کی شان کو پہچانا نہیں۔ ہند کوئی اسلامی سلطنت ہے کہ جس کی وجہ سے شیخ الہند کہنے پر فخر ہے۔"[3] ایک اور مجلس میں فرمایا "اکثر لوگ حضرت دیوبندی کو فخراً شیخ الہند لکھتے ہیں۔ مجھ کو اس قدر ناگوار ہوتا ہے کہ شیخ العالم کو شیخ الہند کہتے ہیں۔ بس افسوس ہے ان کی سمجھ پر۔ ان کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی وائسرائے کو کانسٹیبل کہے۔ یہ اہانت نہیں ہے؟ یہ تعریف ہے؟ جس کو مولانا رومی کہتے ہیں ؎

۱۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب۔ اشرف السوانح جلد سوئم (لاہور) ص ۳۱۴ تا ۳۱۸
۲۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص: ۱۰۹ - ۱۰۵
۳۔ الافاضات الیومیہ جلد اول ص ملفوظ ۴۲۶

شاہ را گوید کسے جولاہ نیست
ایں نہ مدح است او مگر آگاہ نیست

اگر ایسا ہی تھا تو شیخ العرب کہنا چاہئے تھا۔ نسبت بھی کی تو کفر کے ملک سے۔ یہ کون سے فخر کی بات ہے۔"[1] ایک اور مجلس میں فرمایا "حضرت مولانا کی ذات بڑی عجیب ہے۔ مدعیان محبت نے تو ان کو پہچانا ہی نہیں۔ ہمارے اعتقاد میں تو وہ شیخ الہند والسند والعرب والعجم ہیں۔"[2]

مولانا تھانوی اکثر مولانا محمود حسن کی تواضع، حسن اخلاق اور محبت کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ "حضرت استاذی مولانا محمود حسن مجسم اخلاق تھے۔" ایک مجلس میں مولانا دیوبندی کے تذکرہ پر فرمایا "میں جب کبھی دیوبند گیا تو بہت کم ایسا ہوا کہ میں حاضری میں سبقت کر سکا ہوں۔ ورنہ حضرت خود تشریف لاتے تھے۔"[3]

ایک سال مولانا محمود حسن حج کے لیے تشریف لے گئے تو مولانا تھانوی کے متعلق یہ مشہور کیا گیا کہ آپ نے حدیث کا دورہ شروع کرایا ہے۔ اس واقعہ سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ مولانا تھانوی کو اس بات کا انتظار تھا کہ مولانا محمود حسن ہندوستان سے جائیں اور ہماری کان پکے۔ اس بے بنیاد تہمت تراشی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے مولانا تھانوی نے فرمایا کہ "اگر میں مولانا کے سامنے ہی شروع کر دیتا تو کون سا گناہ تھا بلکہ حضرت مولانا ہی سب سے زیادہ خوش ہوتے۔"[4]

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد دوئم ص ۲۳۰
۲۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص: ۵۹۳
۳۔ الافاضات الیومیہ جلد دوئم ص: ۳۰۲
۴۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص: ۲۹۴

تحریکِ خلافت کے دوران مولانا شبیر احمد عثمانی نے مولانا تھانوی کو ایک خط لکھا کہ "حضرت بڑی مشکل میں ہوں کیا کروں دو بڑوں کے درمیان ہوں"۔ اس پر مولانا تھانوی نے آپ کو لکھا کہ "مولانا محمود حسن سب کے بڑے ہیں۔ مولانا ہی کے فرمانے پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر میں تنہا ہوتا تو خود بھی حضرت کا ساتھ دیتا"۔(۱) ایک مرتبہ فرمایا کہ "اگر مولانا (محمود حسن) مجھ کو تحریک (خلافت) میں شریک ہونے کا حکم فرماتے تو چونکہ میں چھوٹا تھا اس لیے مجبور ہو جاتا مگر حضرت کو کبھی اس کا خطرہ بھی نہیں ہوا بلکہ خیال آیا تو یہ کہ اپنے ایک خاص خادم پانی پتی سے فرمایا کہ بھائی یہ اختلاف تو اچھا معلوم نہیں ہوتا لاؤ میں ہی اپنی رائے سے رجوع کر لوں"۔(۲)

اگرچہ مولانا محمود حسن تحریکِ خلافت کے روحِ رواں تھے مگر آپ نے ہمیشہ خلافِ شرع امور اختیار کرنے پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ مولانا تھانوی اپنے استاد کے اس اندازِ فکر کی بہت تعریف فرماتے۔ اسی طرزِ عمل کے متعلق ایک مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ "حضرت محمود حسن کے متعلق فلاں راوی ہیں۔ انہوں نے اپنے کانوں سے سنی اور آنکھوں سے دیکھی ہے کہ جس وقت حضرت مالٹا سے تشریف لائے تو بمبئی کی بندرگاہ پر استقبالی گروہ بہت زیادہ تعداد میں موجود تھا حضرت مولانا اور دو مولوی صاحب ایک موٹر میں تھے اور بعض دوسرے لیڈر بھی موجود تھے۔ جس وقت موٹر چلا تو ایک دم اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوا اور اس کے بعد گاندھی کی جے، محمد علی اور شوکت علی کی جے اور مولانا محمود حسن کی جے کے نعرے بلند ہوئے۔ حضرت نے شوکت علی کا دامن پکڑ کر کہا کہ یہ کیا۔ اس پر شوکت علی نے کچھ خیال نہ کیا تو حضرت نے دوبارہ سختی سے فرمایا کہ اس کو بند کرو۔ اس پر شوکت علی نے کہا کہ حضرت جے کے معنی

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص: ۵۰۳ - ۵۰۲

۲۔ القول الجلیل ص ۶۹

فتح کے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ اگر یہ بات ہے تو رام رام کہا کرو اور جو کچھ بھی ہو یہ شعارِ کفر ہے۔ اور اسی طرح حضرت نے دیوبند اور اس کے قرب و جوار میں اپنے اہتمام سے قربانیاں بھی کروائیں"۔(۱)

مولانا تھانوی اپنے استاد مولانا محمود حسن کی تواضع، حق پرستی اور بے نفسی کے بیحد مداح تھے اور اکثر اپنی مجالس میں آپ ان صفات کا ذکر اور تعریف فرماتے۔ ایک مجلس میں فرمایا کہ "اپنے حضرات کی جو شان، ان کی حق پرستی اور بے نفسی دیکھی ایسا کسی کو بھی نہ دیکھا حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ جب مالٹا سے تشریف لائے تو میں بھی بغرض زیارت دیوبند حاضر ہوا تھا۔ حضرت نے بڑی شفقت فرمائی۔ وہ باتیں اس وقت یاد آتی ہیں تو ان حضرات کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں"۔(۲)

مندرجہ بالا واقعات اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ مولانا تھانوی اپنے استاد مولانا محمود حسن کا کس قدر احترام و عزت کیا کرتے تھے۔ اب شاگرد کے متعلق استاد کی رائے بھی ملاحظہ ہو تاکہ دونوں کے باہمی تعلقات محبت اور ایک دوسرے کے لیے جذبات و احساسات کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ کچھ لوگوں نے مولانا محمود حسن سے مولانا تھانوی کی تحریکِ خلافت میں عدم شمولیت کی شکایت کی تو اس پر آپ نے فرمایا کہ "ہم کو اس پر بھی فخر ہے کہ ایسی ہمت کا آدمی بھی ہم میں سے ہے کہ جس نے تمام دنیا کی پرواہ نہ کی۔ جو اس کی رائے میں حق ہے اس پر استقلال سے قائم ہے۔ کسی کے دباؤ یا اثر کو ذرہ برابر حق کے

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد ششم ص ۲۵۵

۲۔ الافاضات الیومیہ جلد پنجم ص ۲۲۳

مقابلے میں قبول نہ کیا۔[1] ایک اور موقع پر مولانا تھانوی نے مولانا محمود حسن کا یہ قول دہرایا کہ کیا "تم یہ سمجھتے ہو کہ میں (محمود حسن) جو کہہ رہا ہوں وحی سے کہہ رہا ہوں۔ میری بھی ایک رائے ہے۔ اس کی (مولانا تھانوی) بھی ایک رائے ہے۔" ایک اور شخص کے اعتراض کے جواب میں مولانا محمود حسن نے فرمایا" ہمیں اس پر بھی فخر ہے کہ ایسا شخص جو ہندوستان بھر سے متاثر نہ ہوا ہو وہ بھی ہماری جماعت میں سے ہے۔"[2]

حضرت مولانا محمود حسن جب مالٹا کی نظر بندی کے بعد دوبارہ ہندوستان تشریف لائے تو مولانا تھانوی بھی آپ سے ملاقات کے لیے دیوبند حاضر ہوئے۔ ایک صاحب نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مولانا محمود حسن سے کہا کہ مولانا تھانوی یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ان سے تحریک خلافت کے مسئلے پر کچھ بیان کریں۔ شاید وہ قائل ہو جائیں اور تحریک میں شمولیت اختیار کر لیں۔ اس پر مولانا محمود حسن نے فرمایا کہ" وہ میرا لحاظ کرتا ہے اس لیے میری گفتگو سے وہ بولے گا نہیں اس کو تنگی ہوگی۔ سو میں تنگ نہیں کرنا چاہتا نیز گفتگو کرنے سے رائے نہیں بدلا کرتی۔ رائے واقعات سے بدلا کرتی ہے باقی اس پر یقین ہے کہ جب رائے بدلے گی تو اس کا اعلان کر دے گا۔[3]

ایک مرتبہ چند لوگوں نے مولانا محمود حسن کی بیٹھک میں مولانا تھانوی کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کیے۔ اتفاق سے وہ الفاظ مولانا محمود حسن نے سن لیے۔ اس پر آپ نے سب کو ڈانٹا اور فرمایا کہ" تم ایسے شخص کی شان میں گستاخی کر رہے ہو جس کو میں اپنا بڑا سمجھتا ہوں"۔ یہ

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص: ۹

۲۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص: ۶۱۱ - ۶۱۲

۳۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص: ۶۱۲

واقعہ نقل کرنے کے بعد مولانا تھانوی نے فرمایا کہ" یہ الفاظ میری ذات سے اعلیٰ و ارفع ہیں۔ محض حضرت کی شفقت پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ یہ حضرت کا اپنے سے چھوٹوں سے برتاؤ تھا۔"[1]

حضرت مولانا محمود حسن کی وسیع القلبی کا یہ عالم تھا کہ مولانا تھانوی سے تحریک خلافت سے متعلق نظریاتی اختلاف کو بھی پسند نہیں فرماتے تھے چنانچہ بقول مولانا تھانوی "حضرت دیوبندی کے ایک خاص معتمد اور معتقد مولوی صاحب مجھ سے روایت کرتے ہیں کہ مرض الموت میں جب حضرت دہلی میں تھے اور اختلاف کی خبریں کانوں میں پڑنے لگیں تو حضرت نے فرمایا۔" لاؤ میں ہی کچھ اپنی رائے سے ہٹ جاؤں۔ یہ اختلاف کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا"

مولانا محمود حسن کھلے بندوں اس حقیقت کا اعتراف فرماتے تھے کہ ہم میں سب سے زیادہ مولانا تھانوی عوام کی حالت سے باخبر ہیں۔ رام پور میں ایک صاحب نے اپنے بچے کے ختنہ کی تقریب میں مولانا تھانوی کو مدعو کیا۔ اس تقریب میں مولانا خلیل احمد سہارن پوری اور مولانا محمود حسن بھی موجود تھے۔ جب مولانا تھانوی اس تقریب میں پہنچے تو دیکھا کہ وہاں دعوت کا وسیع پیمانے پر اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ بات مولانا تھانوی کے مزاج کے خلاف تھی چنانچہ آپ وہاں سے واپس لوٹ آئے۔ اس واقعہ کے متعلق جب بعض لوگوں نے مولانا خلیل احمد سے سوال کیا کہ کیا بات ہے کہ آپ تو شریک رہے اور مولانا تھانوی اٹھ کر چلے گئے۔ مولانا خلیل احمد نے جواب دیا کہ" بھائی انہوں نے تقویٰ پر عمل کیا اور جہاں ہمارا ان کا اختلاف ہوتا ہے وہاں یہی وجہ ہوتی ہے۔" جب مولانا محمود حسن سے اس واقعہ پر ان کی رائے طلب کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ" عوام کی حالت سے جس قدر وہ (مولانا تھانوی) واقف ہیں

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد پنجم ص: ۲۴۳ - ۲۴۴

اتنا اہم نہیں"۔ مولانا تھانوی نے اس جواب کے متعلق فرمایا کہ اصل جواب وہی تھا جو مولانا محمود حسن نے دیا۔ مولانا خلیل احمد کا جواب تو اضع کا جواب تھا۔[1]

مولانا تھانوی اور مولانا محمد علی جوہر

مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا محمد علی دو مختلف مکتبہ ہائے فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں ایک طرف مولانا محمد علی تحریک خلافت کے بانی اور اس کے روح رواں تھے وہاں دوسری طرف مولانا تھانوی نے مختلف وجوہ کی بنا پر اس تحریک سے شدید اختلاف کیا اور اس سے علیحدہ رہے۔ تحریکِ خلافت کے دوران مولانا محمد علی اور گاندھی شانہ بشانہ کھڑے جدوجہد میں مصروف نظر آتے ہیں اور ہندوستان کی فضا میں "محمد علی شوکت علی کی جے" کے ساتھ ساتھ "گاندھی کی جے" کے نعروں کی گونج سنائی دیتی رہی۔ مولانا تھانوی اسی گاندھی کو عیار، دجال، شیطان، مکار، بیسویں صدی کا طاغوت اور دشمن اسلام کے القاب سے یاد فرماتے ہیں۔

لیکن اس بنیادی اور ٹھوس اختلاف نے دونوں زعماء کے درمیان ایک دوسرے کے احترام میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ مولانا محمد علی نے تحریکِ خلافت کے دوران ہی ایک مرتبہ تھانہ بھون آنے کی خواہش ظاہر کی۔ مولانا تھانوی نے آپ کی آمد کا خیر مقدم کیا لیکن ساتھ ہی اس سلسلے میں چند شرائط عائد کیں۔ مولانا تھانوی کی پہلی شرط یہ تھی کہ آنے سے پہلے بتلائیں کہ کس غرض سے آرہے ہیں۔ آیا ملاقات مقصود ہے یا کچھ اور۔ اگر مطلق ملاقات مقصود ہے تو پھر شرائط میں کمی ہوگی ورنہ شرائط زیادہ ہوں گی۔ اگر ملاقات کی غرض نہیں تو پھر اول یہ کہ جس وقت وہ تھانہ بھون آئیں گے ان کے لیے بجز بار اول کے بار بار کھڑا نہ ہوں گا۔ دوئم یہ کہ آنے سے

1- القول الجلیل ص: ۹۱ - ۹۲

قبل آنے کی غرض بتلائیں۔ سوئم یہ کہ زمانۂ قیام خانقاہ میں ان کو کسی اور سے گفتگو کی اجازت نہ ہوگی۔ یہ شرائط پیش کرنے کے بعد مولانا تھانوی نے فرمایا کہ "یہ ہیں شرائط اگر منظور ہوں تو بسم اللہ اپنا گھر ہے تشریف لے آئیں"۔[1]

مولانا تھانوی کا مغربی طرز جمہوریت کے بارے میں ایک خاص اندازِ فکر تھا۔ آپ کے نزدیک مغربی جمہوریت اور اسلام دو متضاد چیزیں تھیں۔ مولانا کے ملفوظات میں آپ کو جگہ جگہ مغربی جمہوریت کی مخالفت نہیں بلکہ مذمت ملے گی۔ مولانا فرماتے تھے کہ جو لوگ قرآن کی آیت وشاورهم في الامر سے اسلام میں جمہوریت کا جواز پیدا کرتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس سے اگلی آیت واذا عزمت فتوكل على الله سے خود بخود جمہوریت کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس لیے مولانا کی سیاسی ڈکشنری میں جمہوریت اور عوام کی بجائے خلیفہ بادشاہ اور امیر المومنین کے الفاظ ملتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا تھانوی مغربی جمہوریت کے لیے مغربی بدعت کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ دوسری جانب مولانا محمد علی کا مغربی جمہوریت کے متعلق نظریہ کوئی ڈھکا چھپا نہیں۔ اتفاق سے جن دنوں مولانا تھانوی نے جمہوریت کے لیے مغربی بدعت کی اصطلاح استعمال کی۔ انہی ایام میں مولانا محمد علی شاہ سعود کی قبر شکنی کے خلاف زبردست تحریک چلانے میں مصروف تھے۔ مولانا تھانوی کے جمہوریت کے بارے میں نظریات اور بالخصوص مغربی بدعت کی اصطلاح سے مولانا محمد علی نے یہ تاثر لیا کہ شاید مولانا تھانوی یہ سب کچھ شاہ سعود کی حمایت میں کر رہے ہیں اور اسی بنا پر جمہوریت کے مخالف ہیں۔ اس پر مولانا محمد علی نے ایک سخت مضمون لکھا جس میں مولانا تھانوی کے جمہوریت کے بارے میں نظریات [illegible] لکھا" حجاز کی

1- رئیس احمد جعفری سلطانیات محمد علی (حیدر آباد دکن ۱۹۳۵ء) ص ۵۳ - ۵۵

مقدس سرزمین پر ایک عہد شکن بادشاہ (شاہ سعود) کے قبضہ جما لینے پر مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہ العالی کا دل اس قدر باغ باغ ہوا کہ وہ جمہوریت کو مغربی بدعت کہنے لگے۔ سلطان ابن سعود کی مطلق العنانی کو عین اسلام ظاہر کرنے لگے اور چونکہ وشاورھم فی الامر کی نص صریح سے عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا۔ اس لیے ربڑ کو جس طرح ضرورت کے وقت خوب کھینچا جا سکتا ہے۔ تاویل کے ذریعے نص صریح سے بے ادبی کی گئی اور فرمایا کہ جی ہاں وشاورھم فی الامر تو صحیح ہے مگر یہ ولایت کے لکھے پڑھے جو مولانا بن بیٹھے ہیں۔ یہ بھول گئے کہ ذ

اذا عزمت فتوکل علی اللہ۔

ایسے بلند پایہ عالم کے قلم سے جب ایسی تاویلیں نکلیں تو کس طرح مسلمانوں کی حالت پر رونا نہ آئے۔ تعجب ہے کہ مولانا جو خود ولایت کے پڑھے لکھے ہوئے نہیں ہیں اور جنہیں فرنگی محل نے بھی مولانا کا خطاب عطا نہیں کیا ہے۔ ان الفاظ کو یاد رکھا مگر یہ بھول گئے کہ اذا عزمتم نہیں ہے بلکہ واذا عزمت ہے اور یہ خیال نہیں فرمایا کہ عزمت کی ضمیر سلطان ابن سعود جیسے غیر معصوم خاطی بادشاہ کی طرف نہیں پھرتی بلکہ ایک معصوم اور غیر خاطی نبی سردار کونین اور باعث تکوین دو عالم کی طرف پھرتی ہے جس کا عزم بالجزم سوائے خدا کے کسی کی مدد کا محتاج نہیں تھا۔"(۱)

مولانا محمد علی جوہر کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص ملکہ عطا فرمایا تھا کہ کسی لفظ کے حروف کے معمولی سے تغیر و تبدل سے اس لفظ کو نئے معنی پہنا دیتے تھے مثلاً لارڈ برکن ہیڈ Lord Birkenhead کو لارڈ بروکن ہیڈ Lord BROKENHEAD اور ریڈرز سیکنڈ اللہ کو ان کی ہندو نوازی کے پیش نظر راجی گنگادل میں تبدیل کر دیا گیا تھا اسی طرح ایک مرتبہ اپنے ایک

۱۔ رئیس احمد جعفری مطائبات محمد علی (حیدرآباد دکن ۱۹۳۵) ص ۵۳ - ۵۵

دوست کو ایم اے او کالج علی گڑھ کے بارے میں لکھا کہ آج کل ہمارے پرنسپل آرچ بولڈ (ARCH BOLD) ہیں اور سیکرٹری آرچ ویک (ARCH WEAK)

نواب محسن الملک جو کہ نہایت نرم طبیعت کے انسان تھے اسی طرح اخبار ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر شیپرڈ Shepnard کے بارے میں لکھا کہ

There are many a sheep without a Shepnard
but he is a Shepnard without a Sheep

مولانا محمد علی نے اپنے اس مخصوص فن کو مولانا تھانوی پر بھی استعمال کیا مولانا تھانوی اپنے اصول کی پابندی کرنے اور دوسروں سے کرانے کی بنا پر عوام میں "سخت" مشہور ہو گئے اور چونکہ آپ کا وطن تھانہ بھون تھا لہٰذا مولانا محمد علی جب بھی اپنے رفیق مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے ملتے تو ان دونوں رعایتوں کی وجہ سے پوچھتے کہ "ہمارے تھانیدار صاحب کا کیا حال ہے"(۱) لیکن اس اختلاف رائے کے باوجود دونوں زعما ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے تھے مولانا تھانوی جب کبھی ہندوؤں کی بدعہدی کا تذکرہ کرتے تو مولانا محمد علی کا حوالہ ضرور دیا کرتے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ "اگر وہ ہندو (گاندھی) مسلمانوں کا ہمدرد اور خیر خواہ تھا جیسا کہ بعض بداندیش اس کو سمجھے ہوئے تھے یا اب تک سمجھے ہوئے ہیں تو محمد علی تو پاس ہیں ان کا فیصلہ دیکھ لو کہ کس طرح الگ ہو گئے ہیں"(۲)

مولانا محمد علی کو جب ہندو ذہنیت نے مایوس کر دیا اور آپ نے ان سے علیحدگی اختیار کر کے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا بیڑہ اٹھایا تو مولانا تھانوی نے ان کے اس جذبہ کی بے حد قدر کی چنانچہ اس علیحدگی کے بعد مولانا تھانوی اکثر مولانا محمد علی کی خوش عقیدگی،

۱۔ رئیس احمد جعفری سیرت محمد علی (لاہور ۱۹۵۰) ص ۱۱۷

۲۔ الافاضات الیومیہ جلد پنجم ص ۹۹

مہذب اور حق واضح ہو جانے کے بعد ہندوؤں سے علیحدگی پر ان کی تعریف فرماتے تھے۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ "تمام لیڈروں میں بے چارے محمد علی کے اندر یہ بات تھی کہ وہ مہذب تھے اسی زمانہ (تحریک خلافت) میں میں نے ایک معتبر راوی سے سنا کہ علی گڑھ کالج میں نماز کے بعد میرے لیے دعا کرائی تھی کہ یا اللہ اس ہستی کو ہمارے ساتھ کر دے۔" (۱)

ایک اور مجلس میں فرمایا کہ "ہاں محمد علی سے باوجودیکہ وہ اس کے (جامعہ ملیہ) بانی ہیں مجھ کو محبت ہے ایک تو وہ مہذب اور خوش نیت تھے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ وضوح حق کے بعد اہل باطل کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔"(۲)

کانگرس سے تعاون کے تلخ نتائج نے مولانا محمد علی کو کانگرس سے علیحدگی پر مجبور کر دیا اور یوں دونوں رہنما ؤں کو ایک دوسرے کے قریب آنے اور سابقہ غلط فہمیوں کو ختم کرنے کا موقع میسر آیا۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۹۳۰ء میں اس بات کی کوشش کی کہ مولانا جوہر اور مولانا تھانوی میں ملاقات کی کوئی صورت نکل آئے۔ چنانچہ ایک روز موقع پاکر مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے مولانا تھانوی سے کہا کہ آپ تو چونکہ سفر کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں اس لیے اگر آپ اجازت دیں تو مولانا محمد علی کو ہی تھانہ بھون لے آؤں۔ اس پر مولانا تھانوی نے فرمایا "ارے نہیں وہ تو بڑے آدمی ہیں یہاں کہاں آئیں گے۔ یہاں آنے کی دعوت دینا ہرگز مناسب نہیں انہیں بڑی زحمت ہوگی" مولانا دریا آبادی نے کہا "اس سے حضرت کو کیا غرض بلانے والا تو میں ہوں۔ ان کے آنے کی ذمہ داری میرے سر ہے" مولانا تھانوی نے اپنی رضامندی ظاہر

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص: ۲۲۳

۲۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص: ۵۹۰

کرتے ہوئے فرمایا کہ "عرصہ ہوا فلاں صاحب نے بھی یہ تحریک کی تھی کہ وہ یہاں آئیں میں نے پہلے بھی یہی جواب دیا تھا کہ میری تجویز یہ ہے کہ وہ ایک رات خانقاہ میں گزاریں۔ پہلے دن جب وہ تشریف لائیں گے تو میں اٹھ کر ان کی تعظیم کروں گا۔ عزت سے اپنے پاس بٹھاؤں گا لیکن وہ اتنی عنایت کریں کہ اس روز مسائل پر گفتگو نہ کریں بلکہ میری معروضات بڑی خاموشی سے سنیں۔ شب میں آرام کریں۔ طبیعت کو خلو نے ذہن کے ساتھ میری معروضات کو سوچنے کو موقع دیں پھر دوسرے روز جو چاہیں اور جتنی دیر چاہیں ارشاد فرمائیں۔ میں بھی اسی خاموشی کے ساتھ سننے کو تیار ہوں"۔ (۱)

اس گفتگو کے بعد مولانا تھانوی نے مولانا محمد علی سے ملاقات پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ادھر مولانا دریا آبادی نے مولانا محمد علی کو بھی ملاقات کے لیے نیم راضی کر لیا لیکن قدرت کو یہ ملاقات منظور نہیں تھی کیونکہ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد مولانا محمد علی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن چلے گئے جہاں ان کا انتقال ہو گیا۔

۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو مولانا جوہر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ مولانا تھانوی کو جب اس سانحہ کا پتہ چلا تو آپ نے مولانا دریا آبادی کو مندرجہ ذیل تعزیتی خط لکھا جس کا ایک ایک لفظ مولانا محمد علی کے لیے عزت، عقیدت اور محبت میں ڈوبا نظر آتا ہے اور آپ کے دل میں مولانا محمد علی کا جو مقام تھا اس کی بخوبی نشاندہی کرتا ہے۔ مولانا تھانوی نے لکھا "مکرمی السلام علیکم۔ محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہوا ہے بیان نہیں کر سکتا خدا جانے کتنی بار دعا کر چکا ہوں اور کر رہا ہوں۔ مجھ کو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اس اعتقاد کی بناء پر محبت ہے صرف ایک صفت ہے۔ مسلمانوں کی سچی محبت۔ باقی دوسری

۱۔ عبدالماجد دریا آبادی حکیم الامت (ایم ثنا الدین لاہور ۱۹۷۰) ص ۱۵۲ - ۱۵۳

صفات دیکھنے والے جانتے ہوں گے۔ میں اس کو روح الصفات جانتا ہوں"۔ (۱)

مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا حسین احمد مدنی

مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا حسین احمد مدنی دو مختلف سیاسی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ اور دونوں بزرگانِ دین کے سیاسی رجحانات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مولانا حسین احمد مدنی نے اس امر کے متعلق اعتراف کرتے ہوئے ایک اپنے خط میں تحریر فرمایا کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے ہمارا سیاسی اختلاف ہے اور بہت زیادہ اختلاف"۔ (۲)

مولانا تھانوی تحریکِ خلافت سے علیحدہ رہے جبکہ مولانا مدنی نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا مدنی مسلمانوں کا ہندوؤں سے اتحاد اور تعاون نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیتے تھے۔ اسی بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے آپ نے ایک خط میں تحریر فرمایا کہ" ہندوستان کی آزادی کے بارے میں غیر مسلم جماعتوں سے اشتراک نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے"۔ (۳) ایک اور مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا" آج موقع ہے کہ بڑے دشمن (انگریز) سے ترکِ موالات کیجئے۔ اس کو زک دینے کے لیے غیروں (ہندوؤں) کو ساتھ لیجئے۔ اگرچہ انگریز معاملہ چھوت چھات کا نہیں کرتے مگر اسلام کے بدترین دشمن ہیں۔ بخلاف ہنود کے کہ یہ ہمارے پڑوسی ہیں اگرچہ کافر ہیں پڑوسی حق رکھتا ہے (۴)

۱۔ عبدالماجد دریا آبادی۔ محمد علی کی ذاتی ڈائری کے چند اوراق (اعظم گڑھ ۱۹۵۶) جلد دوم ص ۱۸۲

۲۔ نجم الدین اصلاحی "مکتوبات شیخ الاسلام" (اردو بک سٹال) جلد اول ص ۳۰۶

۳۔ مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوم ص ۱۲۸

۴۔ مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول ص ۱۴۰

اس کے برعکس مولانا تھانوی ہندو مسلم اتحاد کو بے معنی، عملی اور پُر فریب مغروضہ سمجھتے تھے مولانا کی یہ پختہ رائے تھی کہ ہندو انگریزوں سے زیادہ مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ اسی لیے آپ اس بات کے خواہش مند تھے کہ ہندو اور انگریز دونوں کے ساتھ عدم تعاون کیا جائے کیونکہ دونوں ہی اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ مولانا تھانوی ہندو مسلم اتحاد کے دل فریب اور کھوکھلے نعرے میں بالکل یقین نہیں رکھتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں آپ کا کہنا تھا کہ" اگر حکومت ہندو اور مسلمانوں کے ہاتھ میں آجائے اور تیسری قوم کے بے دخل بھی ہو جائیں کامیابی تب بھی ہندوؤں کی ہوگی۔ ایک تو ترکیب کے لحاظ سے دوسری ان کی اکثریت کی بناء پر تیسرے ان کے طبائع کی حالت پر نظر کر کے۔ اور عقلی طور پر مقصود حکومت عادلہ ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک میں یہ احتمال ہی نہیں کہ عدل ہو جیسا کہ ہندوؤں کی کارگزاری سے ظاہر ہے کہ وہ مسلمانوں کو ہندوستان سے مٹانا چاہتے ہیں۔ یہ اپنے دلی مذاق سے باز نہ آئیں گے"۔ (۱)

کیا طلبہ بالخصوص دینی مدارس کے طلبہ کو سیاست میں حصہ لینا چاہیئے۔ یہ مسئلہ بھی دونوں زعماء کے درمیان اختلاف کا سبب بنا۔ ایک طرف تو مولانا تھانوی نہ صرف طلباء بلکہ اساتذہ کے بھی سیاست میں حصہ لینے کے سخت خلاف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب دارالعلوم دیوبند کے طلبہ اور اساتذہ نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا تو مولانا تھانوی نے دارالعلوم دیوبند کی سرپرستی سے استعفیٰ دے دیا۔ مولانا تھانوی فرماتے تھے کہ" طالب علمی کے زمانے میں کسی اور شغل میں مشغول ہونا تعلیم کو برباد کر دیتا ہے۔ طالب علم کے لیے یکسوئی اور جمعیت قلب بہت ضروری ہے۔ اس کے برباد ہونے سے تعلیم برباد ہو جاتی ہے۔ میں نے زمانۂ

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص ۳۲۹ – ۳۳۰

طالب علمی میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت ہونے کی درخواست کی تھی تو اس پر حضرت نے فرمایا تھا کہ جب تک کتابیں ختم نہ ہو جائیں اس خیال کو شیطانی سمجھنا۔(۱) مولانا تھانوی کے خیال میں اگر طلباء سیاست میں ملوث ہوں گے تو اپنے اصل مقصد یعنی تعلیم سے دور ہٹ جائیں گے۔

ادھر مولانا حسین احمد مدنی طلباء کے سیاست میں حصہ لینے کے حامی تھے۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں "نوجوان طلباء کو اپنی تعلیمات کو پورا کرنا چاہیئے اور ایام طالب علمی میں کسی ملکی سیاست میں حصہ نہ لینا چاہیئے ہاں فارغ اوقات میں حصہ لینا صحیح ہے"(۲) ایک اور خط میں تحریر فرمایا کہ "طلباء نے جلسے کئے بے شک جلوس کئے ادارہ اہتمام نے روکا تو نہیں اس سے زیادہ اور کیا جرم تھا۔"(۳)

کانگرس کے بارے میں بھی دونوں متضاد رائے رکھتے تھے۔ جہاں ایک طرف مولانا تھانوی کانگرس میں مسلمانوں کی شرکت کو ان کی دینی موت قرار دیتے تھے وہاں دوسری جانب مولانا حسین احمد مدنی کھلم کھلا اپنے آپ کو کانگرس کا حامی ہونے کا اعلان فرماتے اور کانگرس کو ملک کی "مشترکہ جماعت" قرار دیتے تھے۔(۴)

کانگرسی رہنما گاندھی کے بارے میں بھی دونوں یک رائے نہیں تھے بلکہ مولانا مدنی تو گاندھی کو مہاتما گاندھی کے نام سے یاد کرتے ہیں(۵) اور مولانا تھانوی اسی گاندھی کو دجال،

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد اول ص ۲۲۰ (۲) مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول ص ۳۴۲

۲۔ مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول ص ۳۵۳

۴ ابوالحسن فرمودات مدنی (دیوبند کوئی سن ندارد) ص ۲۳۰

۵ حسین احمد مدنی نقش حیات (دیوبند ۱۹۵۴ء) ص ۲۳۶

طاغوت، شیطان، عدو اسلام، بدفہم، بددین، چالاک، مکار کے خطابات سے یاد کرتے ہیں۔

دار العلوم دیوبند سے استعفیٰ

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی نہ صرف کانگرس کے حامی بلکہ کانگرس کی حمایت میں ملکی سیاست میں بہت سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے۔ مولانا مدنی کا یہ فعل مولانا تھانوی کے خیال میں دار العلوم دیوبند کے مفاد کے منافی تھا جب مولانا حسین احمد دار العلوم کے صدر مدرس مقرر کئے گئے تو آپ نے سیاست میں بہت سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا۔ مولانا تھانوی تو کانگرسی سیاست کے زبردست مخالف تھے اسی لیے آپ نے بطور احتجاج دار العلوم دیوبند کی سرپرستی سے استعفیٰ دے دیا۔

اس واقعہ نے دونوں زعماء کے تعلقات میں کچھ تبدیلی پیدا کر دی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے مولانا عبد الماجد دریا آبادی کو ایک خط میں لکھا کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ مولانا حسین احمد کانگرس کی شرکت کو فرض قرار دیتے ہیں۔ اس صورت میں معلوم نہیں کہ اپنے خاص متعلقین کے لیے تارکین فرض سے خاص تعلق رکھنے والوں کو عقلاً یا شرعاً یا طبعاً پسند کرتے ہیں یا کہ نہیں۔ اس لیے خاص عقیدت رکھنے والوں پر لازم ہے کہ مولانا حسین احمد سے ایسے طریقے سے کہ مولانا اپنا اصل خیال ضرور ظاہر فرمائیں۔ ضرور تحقیق کر لیں کہ مجھ جیسے تارک فرض سے ان صاحبوں کا ملنا ان کے قلب لطیف پر گراں تو نہ ہوگا۔" (۱)

ادھر ستمبر ۱۹۳۶ء میں ایک اور واقعہ نے مولانا تھانوی کے رویہ میں سختی پیدا کر دی۔

۱۔ حکیم الامت ص ۱۶۶

دیوبند ریلوے سٹیشن پر دارالعلوم دیوبند کے کچھ طلباء اور اساتذہ نے ایک ہندو لیڈر کا خیر مقدم کیا اور کچھ اکابر دیوبند نے اس کے پاس جا کر اس سے ملاقات بھی کی۔ مولانا تھانوی کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ نے اس پر سخت ناراضی کا اظہار فرمایا اور اس بارے میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو (جو دونوں سے عقیدت رکھتے تھے) ایک خط لکھا جس میں اس واقعہ پر گہرے رنج اور دکھ کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ "اس واقعہ سے عام مسلمانوں پر جو اثر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اس قدر صدمہ ہوا کہ اس کی برداشت کے بجز کوئی صورت نہیں کہ آج ہی سے میں ایسے حضرات کو زیارت و محبت سے محروم کر دوں کیونکہ ان تعلقات سے اس صدمہ کی تجدید ہو گی جس کا تحمل میری ہمت سے خارج ہے اسی طرح میں ایسے حضرات کو جو دونوں طرف سے خصوصیت کا تعلق رکھنا چاہتے ہیں مشورہ دیتا ہوں کہ اس خیال کو دل سے بالکل نکال دیں۔ اسلم یہی ہے کہ ایک طرف سے تعلق رکھیں۔ سہل یہ ہے کہ مجھ کو چھوڑ دیں۔

خط خاص :۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ کی زبانی مجھ کو یہ پیغام پہنچایا گیا تھا کہ ہم طلبہ میں کانگرسی اثر نہیں پھیلاتے۔ کیا یہ کانگرسی اثر نہیں۔ کیا ان کی شرکت اور طلبا کو منع سے نہ روکنا اس کا سبب قریب و مؤثر نہیں۔ پھر قول و فعل میں تطابق کہاں" (۱)

مولانا شبیر احمد عثمانی کے نام ایک خط میں لکھا کہ "میں تو علم الیقین سے بڑھ کر عین الیقین رکھتا ہوں کہ کانگرسی مسلک کی روح مدرسہ میں ڈالنا چاہتے ہیں"۔ (۲)

۱۔ حکیم الامت ص : ۵۰۰ - ۵۰۱

۲۔ انوار عثمانی ص : ۵۵

ایک مجلس میں دارالعلوم سے استعفیٰ کے متعلق مولانا تھانوی نے خود فرمایا کہ "علماء کو تو اپنے پڑھنے لکھنے کی طرف مشغول رہنا چاہیئے۔ دیکھیئے جس قدر متمدن قومیں اور سیاسی قومیں ہیں ان میں بھی تقسیم عمل ہوتی ہے۔ اگر سب ہی ایک طرف اور ایک ہی کام میں لگ جائیں تو ملک کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اس مدرسہ (دیوبند) کی سرپرستی میرے سر تھوپ دی گئی مگر وہاں سیاست کا زور ہو گیا اس لیے میں چاہتا تھا کہ کسی طرح سبکدوش ہو جاؤں"۔ (۱)

مفتی محمد شفیع نے مولانا تھانوی کے دارالعلوم سے استعفیٰ کے متعلق راقم کے استفسار کے جواب میں لکھا کہ حضرت قدس سرہ کے استعفیٰ از سرپرستی دارالعلوم کی بڑی وجہیں دو تھیں۔ اول تو حضرت کو کسی تعلیم گاہ کے طلباء اور مدرسین کا ملک کی عملی سیاست میں حصہ لینا اصولاً پسند نہ تھا خصوصاً کانگرسی سیاست جس میں ایک طرف تو یورپ کی نقالی تھی دوسری طرف ہندو مفادات اور مسلمانوں کی نفرت ہی نفرت کا مشاہدہ تھا۔ جب حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی دارالعلوم کے صدر مدرس ہوئے وہ شدت سے عملی سیاست میں حصہ لیتے تھے خصوصاً ان کی سیادت میں جمعیۃ العلماء ہند نے کانگرس کا ضمیمہ ہونا قبول کر لیا۔ یہ سیاست حضرت کے نزدیک مطلقاً اسلام اور مسلمانوں کے وقار کے منافی تھی خصوصاً عربی مدارس کی تو اس میں تباہی تھی۔ جب ممبران دارالعلوم کا ایک عنصر مولانا مدنی کا ہم خیال ہو گیا اور حضرت کی منشاء کے خلاف کانگرسی سیاست دارالعلوم میں داخل ہو گئی تو حضرت نے استعفیٰ دے دیا۔ اول اول ممبران نے استعفیٰ قبول کرنے سے انکار کر دیا مگر آخر میں حضرت

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد سوئم ص ۲۱۸

نے خود استعفے کا اعلان دارالعلوم کے دروازے پر چسپاں کروا دیا۔"(۱) مولانا ظفر احمد عثمانی نے بھی استعفے کی یہی وجوہ بیان کیں۔ آپ نے راقم کو لکھا "حضرت حکیم الامت مدارس عربیہ اسلامیہ میں ملکی سیاست میں مشغولی کو طلبا کے لیے تو مطلقاً اور مدرسین کے لیے بھی بلاشبہ پسند نہ کرتے تھے کہ اس سے تعلیم میں خامی پیدا ہوتی ہے۔ مولانا حسین احمد صاحب دارالعلوم کے طلبا کی سیاست میں مشغولی کو اچھا سمجھتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک یہ بھی جہاد تھا۔ مولانا تھانوی کا ارشاد تھا کہ کانگرس میں اکثریت ہندوؤں کی ہے جھنڈا بھی ہندو اکثریت کا ہے مسلمان محض ان کے تابع ہیں یہ صورت جہاد نہیں ہو سکتی۔ اس لیے مدارس میں یہ تحریکات مناسب نہیں۔ اہل دارالعلوم نے حضرت کی رائے پر عمل نہ کیا تو آپ نے استعفیٰ دے دیا"(۲)

لیکن ان تمام نظریاتی اختلافات نے دونوں زعماء کے ذاتی تعلقات میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ دونوں نے اختلافات کے باوجود شائستگی اور وقار کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اس کا اندازہ دونوں کے خطوط اور ملفوظات پڑھ کر بخوبی ہو سکتا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی ۱۹۲۸ء میں مولانا حسین احمد مدنی کے ہمراہ تھانہ بھون تشریف لے گئے۔ مولانا دریا آبادی کے اپنے الفاظ میں "مولانا اشرف علی تھانوی نے مولانا حسین احمد کا استقبال تپاک اور التفات سے کیا۔"(۳) مولانا دریا آبادی اپنی باطنی اور روحانی اصلاح کے لیے ایک مرشد کی تلاش میں تھے اور اس سلسلے میں ان کی نگاہِ انتخاب مولانا تھانوی اور مولانا مدنی پر پڑی

۱۔ مکتوب گرامی مفتی محمد شفیع بنام راقم ۷ جولائی ۱۹۶۶ء

۲۔ مکتوب گرامی مولانا ظفر احمد عثمانی بنام راقم ۶ ربیع الاول ۱۳۸۶ھ

۳۔ حکیم الامت ص ۲۶

بالآخر صلاح و مشورہ کے بعد مولانا دریا آبادی نے مولانا حسین احمد مدنی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ بیعت کے بعد مولانا مدنی نے مولانا دریا آبادی کو ایک خط لکھا جو ظاہر کرتا ہے کہ سیاسی اختلافات کے باوجود دونوں حضرات ایک دوسرے کا کس قدر احترام کیا کرتے تھے مولانا مدنی نے لکھا "آپ تو خانقاہ (اشرفیہ) پہنچ گئے ہوں گے۔ خداوند وہاں کی حاضری کو باعث غیر مشاہبہ کرے۔ میں نے حسب ارشاد حضرت مولانا تھانوی دامت برکاتہم اور آپ حضرات کے ارشاد پر اس وقت بیعت کر لی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی بدحالی روسیاہی اور ناکامی پر بہت زیادہ گریاں ہوں اور سخت شرمندہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مولانا دامت برکاتہم کے دربار میں پہنچا دیا ہے۔ مولانا کو آپ سے اور آپ کو مولانا سے انس پیدا ہو گیا ہے۔ اب ضروری اور مناسب ہے کہ آپ مولانا تھانوی سے بیعت کر لیں"(۱)

مولانا مدنی کے مکتوبات پر ایک نظر ڈالیے جس جگہ بھی مولانا تھانوی کا ذکر آیا ہے وہاں آپ کو دامت برکاتہم یا رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ملیں گے۔ مولانا مدنی ایک صاحب کو لکھتے ہیں حضرت مولانا دامت برکاتہم کی خدمت اقدس میں جس قدر بیٹھنا میسر ہو غنیمت جانیں(۲) ایک اور صاحب کو مشورہ دیا "حضرت تھانوی کے مواعظ خرید لیجئے بہت مفید ہیں۔ ان کا مطالعہ ضرور رکھیں"(۳) ایک اور خط میں تحریر فرمایا کہ "موجودہ مشائخ میں حضرت مولانا خلیل احمد، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا عزیز الرحمٰن اور مولانا شبیر احمد عثمانی یہ جملہ حضرات ہر قسم کے

۱۔ مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول ص ۱۲۲

۲۔ مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول ص ۱۲۲

۳۔ مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوم ص ۱۱۳

کمالات کے حاوی ہیں اور بعض مسائل میں بعض حضرات کا مخالف ہونا دوسری بات ہے۔ اس لیے ان بزرگوں سے استخارہ مسنونہ مکرر کر لینے کے بعد تعلق پیدا کرنا ضروری اور مفید ہے۔"(۱) ایک صاحب نے مولانا حسین احمد سے بذریعہ خط دریافت کیا کہ "کیا یہ درست ہے کہ مولانا تھانوی نے شیخ الہند (مولانا محمود حسن) کو قید کروایا تھا اور کیا مولانا گورنمنٹ کی مخبری کرتے تھے اور مشرکانہ عقائد رکھتے تھے۔" مولانا مدنی نے ان تمام لغو اور بے بنیاد الزامات کی تردید کرتے ہوئے واضح الفاظ میں لکھا کہ "یہ بالکل غلط ہے کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ نے حضرت شیخ الہند کو مالٹا میں نظر بند کروایا تھا۔ وہ حضرت شیخ الہند کے شاگرد اور محبین میں سے تھے البتہ تحریک آزادی میں ان کی رائے خلاف تھی نہ انہوں نے مخبری کی اور نہ ان کو انگریزوں سے اس قسم کے تعلقات رکھنے کی نوبت آئی۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ معاذ اللہ ہرگز مشرکانہ عقائد نہیں رکھتے تھے۔ بہت توحید پرست اور خدا پرست تھے۔ تصوف میں ان کا قدم بہت راسخ تھا۔ پیری مریدی بھی حضرت قطب عالم حاجی صاحب اور حضرت گنگوہی کے حکم پر انکی اجازت سے کرتے تھے۔ علم ظاہر میں بھی ان کا قدم بہت راسخ تھا۔ حضرت تھانوی کے نہ صرف صحیح مسلمان ہونے کا معتقد ہوں بلکہ ان کو بہت بڑا عالم اور صوفی کامل مانتا ہوں۔ ہاں سیاست میں ان کی رائے کو غلط سمجھتا ہوں۔ اس بارہ میں میرا کامل یقین ہے کہ میرے اور حضرت تھانوی کے استاد حضرت شیخ الہند کی رائے نہایت صحیح اور واجب الاتباع تھی۔ یہ حضرت تھانوی کی اجتہادی غلطی تھی جس کی وجہ سے حضرت تھانوی کی شان میں نہ خود گستاخی کرتا ہوں نہ کسی کی گستاخی کو روا رکھتا ہوں۔"(۲) مولانا تھانوی سے شدید سیاسی اختلاف رکھنے کے

۱۔ مکتوبات شیخ الاسلام جلد سوئم ص ۱۹۵، ۲۔ مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوئم ص ۳۲۵-۳۲۶

باوجود یہ فرمایا کہ "جزئیات اور فروع اور اسلامک لا جس کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں ان میں انکا (مولانا تھانوی) قول قابل اعتماد ہوگا۔ مولانا موصوف کا اسلامی تفقہ اور علوم و فنون میں تمام عمر مصروف رہنا' ان کی تعلیم دینا' ان میں اعلیٰ سے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کرنا' ان میں بے شمار مفید اور کارآمد تصانیف تالیف کر کے عالم اسلامی اور خلائق کو فیضیاب بنانا آفتاب کی طرح دنیا میں روشن ہو چکا ہے۔"(۱)

مولانا تھانوی کی نسبت ایک خط میں مولانا دریا آبادی کو لکھا "آنجناب کی توضیحات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ یہ ناکارہ حضرت دامت برکاتہم کا نہایت معتقد اور ان کی تعظیم و احترام کو نہایت ضروری سمجھتا ہے۔ ان کی قابلیت اور کمال کے سامنے اتنی بھی نسبت نہیں رکھتا جتنی طفل دبستان کو فلاطون سے ہو سکتی ہے۔"(۲)

یہ تو تھی مولانا تھانوی کے متعلق مولانا مدنی کی رائے۔ مولانا تھانوی کی جانب سے بھی مولانا مدنی کے لیے اسی نوعیت کے جذبات کا اظہار کیا جاتا تھا مولانا تھانوی نے اپنی ایک مجلس میں فرمایا کہ "ہم انقلاب چاہنے والوں کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ نعم البدل ہو بئس البدل نہ ہو۔ افسوس ان حالات کے مشاہدہ کے بعد بھی بعض علماء ان لیڈروں کا ساتھ دیتے ہیں اور وہ لیڈر ان کو منہ بھی نہیں لگاتے حتیٰ کہ جو بڑے لیڈر ہیں ان کے نام اور کارنامے اخباروں میں چھپتے ہیں اور مولوی صاحب دہلوی (احمد سعید) و مدنی صاحب اس قدر کام کرتے ہیں ان کا کہیں نام تک نہیں۔"(۳)

۱۔ مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول ص ۲۰۶-۲۰۷

۲۔ مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول ص ۱۳۲-۱۳۳

۳۔ الافاضات الیومیہ جلد ششم ص ۱۳۵

مولانا خیر محمد جالندھری نے لکھا کہ مولانا تھانوی نے مولانا مدنی کے متعلق فرمایا کہ "ہمارے اکابر دیوبند میں بفضل تعالیٰ کچھ نہ کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ چنانچہ شیخ مدنی کے دو خداداد کمالات ہیں جو ان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ایک تو مجاہدہ جو کسی دوسرے میں اتنا نہیں دوسرے تواضع چنانچہ سب کچھ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے"[1] مولانا تھانوی نے اپنی ایک مجلس میں مولانا حسین احمد مدنی کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ "حسین احمد صاحب بہت شریف طبیعت کے انسان ہیں۔ باوجود سیاسی مسائل میں اختلاف رکھنے کے کوئی کلمہ خلافِ حدودِ شرع ان سے نہیں سنا گیا۔"[2]

دونوں زعماء کے تعلقات کے ضمن میں مولانا سید محمد میاں نے راقم کو لکھا کہ غالباً ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی گرفتار ہوئے۔ گرفتاری کی خبر جب حضرت تھانوی کو پہنچی تو آپ بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مولوی حسین احمد سے مجھے اتنا قلبی تعلق ہے انکی گرفتاری سے میرے دل پر چوٹ لگی اسی سلسلے میں یہ بھی فرمایا کھانا نہیں کھایا گیا مولانا تھانوی نے فرمایا کہ "مجھ کو اپنی موت پر بھی فکر تھا کہ میرے بعد باطنی خدمت کرنے والا کون ہوگا مگر مولوی حسین احمد کو دیکھ کر تسلی ہوئی کہ دنیا ان سے زندہ رہے گی"۔ ایک اور موقعہ پر مولانا مدنی کے متعلق فرمایا کہ "میں حسین احمد کو ان کے سیاسی کاموں میں مخلص اور بہترین جانتا ہوں ان سے محبت کے ساتھ ایک اختلاف ہے اگر وہ مجبت رفع ہو جائے تو میں ان کے ساتھ ایک ادنیٰ سپاہی بن کے کام کرنے کو تیار ہوں"

۱۔ حاشیہ مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوئم ص ۲۲

۲۔ مفتی محمد حسن (مرتب) الکلام الحسن (تھانہ بھون ۱۹۶۵ء) ص ۱۰

مندرجہ بالا خطوط اور ملفوظات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مولانا تھانوی اور مولانا مدنی سیاسی معاملات میں ایک دوسرے سے اختلاف رائے رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کا کس قدر احترام و عزت کیا کرتے تھے۔ مندرجہ بالا امثال اس بات کو بھی ثابت کرتی ہیں کہ مولانا تھانوی کا تحریکِ خلافت سے اختلاف اصولوں پر مبنی تھا اور اس سلسلے میں شخصی رجحانات و نظریات اس کا سبب نہیں بنے۔

---

(۱) مکتوب گرامی مولانا سید محمد میاں بنام راقم ۲۳ را پریل ۱۹۶۶ء

باب ۳

مولانا تھانوی اور کانگرس

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی مسلمانانِ پاک و ہند کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ جنگِ آزادی کے ختم ہوتے ہی دار و گیر کا وہ بازار گرم ہوا جس میں رحم و انصاف کا کوئی نام نہ تھا۔ اگرچہ اس جنگ میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل تھے لیکن جنگ کے بعد صرف مسلمان ہی انگریزوں کا ہدف بنے۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرسید احمد خان نے کہا تھا کہ "کوئی آفت ایسی نہیں جو اس زمانے میں نہ ہوئی ہو گو وہ ماتا دین اور رام دین نے ہی کی ہو۔ یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی۔ ان دنوں جو اخبارات میری نظر سے گزرے اور جو کتابیں تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں اور ہر ایک میں یہی دیکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بدذات کوئی نہیں مگر مسلمان۔ کوئی کانٹے دار درخت اس زمانے میں نہیں اگا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا۔"(۱)

۱۸۸۴ء میں انڈین سول سروس کے ایک ریٹائرڈ ممبر اے او ہیوم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ہندوستان میں ایک جماعت کا قیام اس لیے نہایت ضروری ہے کہ ہندوستانیوں کے دل کا غبار نکلتا رہے۔ ہیوم جو کہ برطانوی حکومت کا زبردست خیر خواہ تھا۔ برطانوی سلطنت کے مفاد کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس بات کا خواہش مند تھا کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات نہ دہرائے جائیں۔ یہ امر بھی نہایت دلچسپ ہے کہ ہیوم کو یہ خیال سرسید کی کتاب رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند پڑھنے کے بعد پیدا ہوا اور اس بات کا تذکرہ اس نے خود صاحب زادہ آفتاب احمد خان سے کیا تھا۔ ہیوم دراصل کوئی سیاسی جماعت قائم کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کے ذہن میں محض ایک سماجی تنظیم کا نقشہ تھا۔ اس کی یہ بھی خواہش تھی کہ جس صوبے میں اس مجوزہ جماعت کا اجلاس ہو وہاں کا گورنر اس کی صدارت کیا کرے۔ لیکن جب یہ تجاویز گورنر جنرل لارڈ ڈفرن کو پیش کی گئیں تو اس نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے مجوزہ تنظیم کو سیاسی بنیادوں پر قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ لارڈ ڈفرن کا [illegible] یہ تھا کہ چونکہ ہندوستان میں کوئی ایسی سیاسی جماعت نہیں جو حکومت کو اس کی خامیوں سے آگاہ کرے اس لیے ہندوستان میں کوئی ایسی سیاسی جماعت ہونی چاہیئے جو حکومت کو عوام کی مشکلات اور تکالیف سے آگاہ کرتی رہے۔ اے او ہیوم نے لارڈ ڈفرن کے مشوروں کو قبول کیا اور ۱۸۸۵ء میں نیشنل کانگرس کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کر دی گئی۔

مسلمانوں میں سرسید احمد خان پہلے رہنما تھے جنہوں نے کانگرس کی اعلانیہ طور پر مخالفت کی اور مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے اجتناب کریں اپنے آپ کو صرف تعلیم کے لیے وقف کر دیں۔ کانگرس نے ابتداء ہی سے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ ہندوستان میں لوکل باڈیز اور دوسرے اداروں میں انتخاب کا طریقہ رائج کیا جائے۔ سرسید احمد خان نے اس دور کے حالات کے پیشِ نظر کانگرس کے اس مطالبہ کی سختی سے مخالفت کی۔

سرسید کی مانند مولانا تھانوی نے بھی مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ کانگرس کی سرگرمیوں سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔ مولانا تھانوی کی رائے میں چونکہ کانگرس کے ارکان کی اکثریت غیر مسلموں

۱۔ سیاست ملیہ ص ۷

پر مشتمل تھی اور تمام اعلیٰ و اہم عہدے بھی انہی کے قبضے میں تھے اس لیے اگر مسلمان چاہتے تب بھی وہ اس کی اصلاح نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کانگرس میں مسلمانوں کی شمولیت ان کو نہ تو کسی قسم کا کوئی فائدہ پہنچا سکتی تھی اور نہ وہ اپنے مفاد کے خلاف پیش کی گئی کسی تجویز یا قرارداد کو مسترد کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ دوسری جانب آپ کے خیال میں اگرچہ مسلم لیگ بھی نقائص سے پاک نہیں تھی لیکن چونکہ اس جماعت کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی اس لیے اس کی اصلاح کے بہت زیادہ امکانات موجود تھے۔ اس لیے مولانا کا کہنا تھا کہ اس صورت حال میں مسلمانوں کا کانگرس سے علیحدہ رہنا اور مسلم لیگ میں اس کی اصلاح کی غرض سے شامل ہونا مسلمانوں کے مفاد کے عین مطابق تھا۔

مولانا تھانوی کا کانگرس کے بارے میں واضح رویہ سہارن پور کے ایک الیکشن کے دوران سامنے آیا۔ اس انتخاب میں مسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے حصہ لیا۔ انتخابی مہم کے دوران میں کانگرسی حلقوں نے یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ مسلم لیگ کو ووٹ دینا ناجائز ہے۔ مسلم لیگ کے ایک ورکر نے مولانا سے اس صورتِ حال کے شرعی پہلو کی وضاحت چاہی کہ کیا آپ کے نزدیک کانگرس کو ووٹ دینا جائز ہے۔ اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا تھانوی نے کانگرس میں مسلمانوں کی شمولیت کو "ناجائز" اور اس کے لیے کام کرنے کو اہلِ اسلام کے لیے مضر قرار دیا۔ اس سلسلے میں آپ نے قرآن مجید کی ایک آیت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ "کانگرس کے حالات کا معلوم ہونا کافی ہے جو اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے۔" یاایھا الذین امنوا لا تتخذوا بطانة من دونکم لا یالونکم خبالا ودوا ما عنتم قد بدت البغضاء من افواھھم وما تخفی صدورھم اکبر" (اے ایمان والو نہ ٹھہراؤ بھیدی اپنے غیر کو۔ وہ کمی نہیں

کرتے تمہاری خرابی میں۔ ان کو خوشی ہے تم کو جس قدر تکلیف پہنچے۔ ان کی بڑھتی ہے دشمنی ان کی زبان سے اور جو چھپا ہے ان کے جی میں سو اس سے زیادہ ہے) یہ آیت پیش کرنے کے بعد مولانا تھانوی نے لکھا کہ "موجودہ حالات میں حزم و یقین کے ساتھ میری یہ رائے ہے کہ جو شخص کانگرس کی موافقت میں ممبری کا ساعی ہو وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا اور اس کی موافقت اور اس کے لیے سعی کرنے کو اہل اسلام کے لیے مضر سمجھتا ہوں"[1]

۱۹۳۶ء میں الہ آباد مسلم لیگ کے سیکرٹری احسان الحق نے مولانا تھانوی سے دریافت کیا کہ آیا مسلمانوں کے لیے مسلم لیگ میں شمولیت کرنا مناسب ہے یا کانگرس میں۔ اس کے جواب میں مولانا تھانوی نے فرمایا کہ "میری رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو مسلم لیگ میں شامل ہونا چاہیے۔ باقی کانگرس کے حالات جو معلوم ہوتے ہیں ان کی بنا پر تو اس میں ہرگز شامل نہ ہونا چاہیے"[2]

۱۹۳۹ء میں جمعیۃ العلماء ہند کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مولانا تھانوی کو بھی مدعو کیا گیا۔ مولانا نے اجلاس میں شریک نہ ہو سکنے پر اپنی معذوری کا اظہار کرتے ہوئے اس دعوت نامے کے جواب میں جو کچھ لکھا کانگرس کے متعلق آپ کے خیالات کے بارے میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ساتھ ہی اس سے کانگرس کے متعلق آپ کے سخت رویے کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ آپ نے لکھا "اب تو واقعات دکانگرس کے دو سالہ دورِ اقتدار

۱۔ مفتی محمد شفیع، افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ (دیوبند ۱۳۶۵ھ) ص: ۶۵-۶۶

۲۔ روزنامہ انقلاب (لاہور) ۳۰ دسمبر ۱۹۳۶ء ص ۲

(۱۹۳۷ - ۱۹۳۹ء) کے دوران مسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم کی طرف اشارہ ہے) نے مجھ کو اس رائے پر نہایت پختہ کر دیا ہے کہ مسلمانوں خصوصاً علماء کا کانگرس میں شریک ہونا نہ صرف مذہباً مہلک ہے بلکہ کانگرس سے بیزاری کا اعلان کر دینا بہت ضروری ہے۔ علماء کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنی چاہیئے اور مسلمانوں کا کانگرس میں داخل ہونا اور داخل کرانا میرے نزدیک ان کی دینی موت کے مترادف ہے۔"(۱) یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ علامہ اقبال اور مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ دونوں مسلمانوں کی کانگرس میں شمولیت کے بارے میں ہم خیال تھے۔ مولانا تھانوی کی مانند علامہ اقبال کی بھی یہی رائے تھی کہ کانگرس میں مسلمانوں کی غیر مشروط شمولیت اسلام اور مسلمانوں دونوں کے لیے مضر ہے۔"(۲)

یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے کہ جب تک مسلمانوں نے کانگرس میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی اس وقت تک یہ جماعت محض ایک کاغذی جماعت کی حیثیت رکھتی تھی تحریک کے دوران جب مسلمان اس کی کارروائیوں میں شریک ہوئے تو اس جماعت کو عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ مولانا تھانوی نے اپنی مجالس میں بارہا اس حقیقت کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "کانگرس کی مقبولیت کی وجہ محض یہ تھی کہ مسلمانوں نے اس میں شرکت کی تھی۔ ہندوؤں کی پچاس سالہ مردہ کانگرس کو مسلمانوں نے زندہ کیا۔ جب تک مسلمانوں نے اس میں شرکت کی تھی کسی نے کانگرس کا نام تک بھی نہ سنا تھا۔"(۳) مشہور اچھوت راہنما ڈاکٹر امبیدکر نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ کانگرس

۱۔ افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص ۸۸

۲۔ بشیر احمد ڈار، انوار اقبال (اقبال اکادمی کراچی ۱۹۶۷) ص: ۲۴۳۔

۳۔ الافاضات الیومیہ جلد پنجم ص: ۸۸ - ۸۹

کو عظیم اور طاقتور بنانے والے ہندو نہیں تھے۔"(۱)

کانگرس میں پنڈت نہرو کو جو اثر و رسوخ حاصل تھا وہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں تھی اور جو اشتراکی خیالات کو پھیلانا اپنے مذہب کا جزو سمجھتے تھے۔ مولانا تھانوی کے نزدیک یہی امر سب سے خطرناک تھا کہ کانگرسی عموماً مذہب کے حامی نہیں۔ اسی بناء پر آپ کانگرس کو بالشویک کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنی ایک مجلس میں دوران گفتگو فرمایا کہ "جو آدمی بھی حدود شریعت سے گزر کر کام کرے گا اس کا برا ہی حشر ہوگا۔ اس بنا پر ہم کانگرسیوں کی مدد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہمارے خیال میں کانگرسی اصل میں بالشویک ہیں۔ یہ کسی طرح بھی مذہب کی حامی جماعت نہیں بلکہ محض سیاسی جماعت ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ جماعت برسر اقتدار آگئی اور خدا نہ کرے وہ دن بھی آئے تو یہ بھی ہندوستان میں وہی کریں گے جو بالشویک کر رہے ہیں۔"(۲)

مولانا تھانوی کی مجالس میں جب بھی کانگرس کا تذکرہ ہوا آپ نے مسلمانوں کو یہی مشورہ دیا کہ وہ اس میں شمولیت سے گریز کریں۔ ایک مجلس میں فرمایا کہ "کانگرس میں مسلمانوں کی شرکت کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کرنا ہے۔ مسلمانوں کی کانگرس میں شرکت، ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا یا ان کو ساتھ ملا کر کام کرنا اسلام اور مسلمانوں دونوں کے لیے نہایت خطرناک ہے۔" مولانا تھانوی کی یہ پختہ رائے تھی کہ کانگرس انگریزوں کے ہندوستان سے اخراج میں مخلص نہیں بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ انگریزوں سے مل کر اپنی قوم کو پروان چڑھاتی رہے۔ اسی سلسلے میں دوران گفتگو فرمایا کہ "کانگرس

۱۔ الافاضات الیومیہ جلد پنجم ۸۸ - ۸۷

۲۔ الافاضات الیومیہ جلد چہارم ص ۱۲۱ - ۱۲۲

ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنا نہیں چاہتی اور درحقیقت ان کی عافیت بھی اسی میں ہے کہ انگریز ہندوستان میں رہیں ورنہ سارے ہندو اطمینان سے ہرگز حکومت نہیں کر سکتے۔ اسی لیے انگریزوں کے زیرِ سایہ وہ کر اپنی قوم کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔" ایک اور مجلس میں کانگریسی علماء کے ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہندو انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا نہیں چاہتے ان کا نفع تو انگریزوں کے قیام ہی میں ہے۔"(۱)

کانگریسی علماء

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ مولانا تھانوی کے نزدیک کانگریس کی مقبولیت کا واحد سبب اس میں مسلمانوں کی شرکت تھی اور علماء کی شرکت نے تو اس کو اور بھی مقبول بنا دیا تھا۔ مولانا تھانوی نے کانگریسی علماء کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ علماء کی ایک جماعت تو وہ تھی جو اپنی تقاریر اور مضمون نگاری کی وجہ سے عوام میں مولانا کے نام سے مشہور ہو گئی اگرچہ یہ لوگ باقاعدہ طور پر عالم نہیں تھے۔ علماء کی دوسری جماعت وہ تھی جو باقاعدہ دین کا علم رکھتی تھی اور بدقسمتی سے کانگریس کا ساتھ دے رہی تھی۔ مولانا تھانوی کو علماء کی اسی جماعت سے گلہ تھا کہ وہ فنافی الکانگریس ہو کر حدودِ شریعت سے تجاوز کر رہے تھے مولانا تھانوی کو اس گروہ سے یہ شکوہ تھا کہ وہ انگریزوں کے بغض کی وجہ سے کانگریس کے ساتھ بوجوہ موافقت کر رہے تھے اور اس سلسلے میں شرعی حدود و قیود کو بھی نظر انداز کر رہے تھے۔ ایک مجلس میں کانگریسی علماء کے اس طبقے کے رویہ کے بارے میں اظہارِ افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ دوسری قسم کے لوگ صاف کہتے ہیں کہ اگر ہندوستان

۱۔ ابرارالحق حقی، اسعد الابرار (بارہ بنکی، ۱۹۲۰ء) ص: ۱۳۶

سے انگریز نکل جائے تو تمام عالم کو سکون ہو گا۔ اس لیے ہم کو جان توڑ کوشش کرنی چاہیے خواہ ہندوستان کے مسلمانوں کا ایمان ہی کیوں نہ برباد ہو جائے۔ یہ علماء کانگریس میں اپنی شمولیت کے جواز میں کہتے تھے کہ اس طرح کانگریس پر مسلمانوں کا قبضہ اور غلبہ ہو جائے گا۔ مولانا تھانوی ان کی اس دلیل سے متفق نہیں تھے اور جواباً یہ فرماتے تھے کہ "اگر واقعی مقصود یہی ہے تو اس مقصد کا حصول مسلم لیگ میں زیادہ آسان ہے کیونکہ مسلم لیگ والے اتباع کے لیے آمادہ ہیں۔ چنانچہ مسلم لیگ کے بڑے بڑے ارکان نے مجھے بتایا کہ ہم حضرات علماء کی رائے کے اتباع کے لیے تیار ہیں اور کانگریسی تو خود اپنا تابع بناتے ہیں۔ ان پر غلبہ پانا مشکل ہے۔"(۱)

علامہ اقبال بھی مولانا تھانوی کی اس رائے سے متفق تھے کہ علماء کو کانگریس اور ہندوؤں کا ساتھ نہیں دینا چاہیے بلکہ مسلمانوں کو خود اپنی تنظیم کو مضبوط کرنا چاہیے۔ ایک گفتگو کے دوران علامہ اقبال نے فرمایا کہ "کانگریسی خیال کے علماء ہندوؤں کا ساتھ دے کر بڑی غلطی کر رہے ہیں وہ نہیں سمجھتے کہ اگر قوم نے ان کا ساتھ دیا تو اس کا نتیجہ نہایت مہلک ہو گا۔"(۲)

کانگریس کا دوسالہ دورِ استبداد ۱۹۳۷-۱۹۳۹
مولانا تھانوی کی نظر میں

دسمبر ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی تاسیس کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے نواب وقارالملک نے فرمایا تھا کہ "اس وقت اپنی قوم پر وہ قوم حکمران ہو گی جو تعداد میں ہم سے چار گنا ملینہ والے صاحبو ہم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے دل میں اس بات پر غور کرے کہ اس وقت ہماری کیا حالت ہو گی۔ اس وقت ہمارا مذہب، ہماری جان، ہمارا مال، ہماری آبرو

۱۔ اسعد الابرار، ص: ۱۳۶

۲۔ سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور (کراچی ۱۹۷۱) ص: ۲۵۶

سب خطرے میں ہوگا۔ آج جب کہ برٹش کی زبردست سلطنت اپنی رعایا کی محافظ ہے جس قسم کی مشکلات بسا اوقات ہم کو اپنے دوستوں (ہندوؤں) سے پیش آتی رہتی ہیں۔ اس کے نظائر کم و بیش ہر صوبہ میں موجود ہیں۔ تو وائے اس وقت پر جب کہ ہم لوگوں کو ان لوگوں کا محکوم رہنا پڑے گا جو اورنگ زیب کا بدلہ ہم سے صدہا برس بعد لینا چاہتے ہیں۔"(۱)

وقار الملک کی یہ پیشین گوئی کانگرس کے اسی دو سالہ دورِ اقتدار ۱۹۳۷-۱۹۳۹ء میں صحیح ثابت ہوئی جبکہ اس نے اس مختصر عرصے میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، ثقافت، زبان اور مذہب کو مسخ اور تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

۱۹۳۵ء کے قانون حکومت ہند کے تحت ۱۹۳۷ء میں منعقدہ انتخابات میں کانگرس چھ صوبوں میں واضح اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ ان صوبوں میں حکومت سنبھالنے کے بعد کانگرس نے اردو زبان کو مٹانے، ودیا مندر سکیم اور دیہات سدھار سکیم جیسی مسلم کش سکیموں کو رائج کیا۔ اس دوران میں مسلمانوں پر جو کچھ بیتا پیرپور رپورٹ، شریف رپورٹ، سی پی میں کانگرس راج کی منہ بولتی تصاویر ہیں۔ ان دو سالوں میں مسلمان کس حد تک کانگرسی اور ہندوؤں سے نالاں تھے۔ اس کا اندازہ صرف اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ کانگرسی وزارتوں کے استعفے پر مسلمانوں نے قائد اعظم کی زیر ہدایت یوم نجات (۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء) منا کر اس جابر حکومت کے خاتمہ پر اطمینان کا سانس لیا۔

اُردو زبان:

مشہور فرانسیسی مستشرق گارسین دتاسی نے ہندوؤں کے بارے میں لکھا تھا کہ "وہ ہر اس امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو انہیں مسلمانوں کے عہد کی یاد دلائے"۔ کم از کم اردو زبان کے متعلق تو ہندوؤں کا یہی رویہ تھا۔ یہ ایک مسلمہ تاریخی

۱۔ اکرام اللہ ندوی وقار حیات (مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۲۵ء) ص ۶۶۴، ۶۶۵ ۔

حقیقت ہے کہ اردو زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی۔ دونوں قوموں نے اس کی نشوونما میں برابر کا حصہ لیا لیکن ہندو اپنی تنگ نظری کی بنا پر اس کو محض "مسلمانوں کی زبان" قرار دیتے رہے۔ انہوں نے ۱۸۶۷ء سے ہی اردو کی بجائے ہندی زبان اور ناگری رسم الخط کو دفاتر اور عدالتوں میں رائج کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دی تھی۔ ہندوؤں کے اس طرزِ عمل سے ہندو مسلم اتحاد کے داعی سر سید احمد خان کو سخت صدمہ پہنچایا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ "مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے۔ آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا دیکھے گا۔"(۱)

۱۹۰۰ء میں ایک مرتبہ پھر ہندوؤں نے اردو زبان کی بجائے ہندی زبان کو عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں رائج کرنے کی مہم شروع کی۔ اس مہم میں انہیں یو پی کے لیفٹیننٹ گورنر سر انتھونی میکڈانل کی آشیرباد اور سرپرستی حاصل تھی۔ چنانچہ اس نے اپریل ۱۹۰۰ء میں سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں ہندی زبان رائج کرنے کا حکم دیدیا۔ اس موقع پر نواب محسن الملک نے اردو زبان کی حفاظت کی غرض سے "اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک جماعت قائم کر کے ایک نہایت جرأت مندانہ قدم اٹھایا۔ اس ایسوسی ایشن کے تحت مختلف مقامات پر احتجاجی جلسے منعقد ہوئے جن میں مسلمان زعماء حکومت کے اس غیر دانشمندانہ فیصلے پر نکتہ چینی کرتے رہے۔ اسی سلسلے میں لکھنؤ میں بھی ایک احتجاجی جلسہ منعقد ہوا جس میں نواب محسن الملک نے نہایت جذباتی انداز میں تقریر کی۔ سر عبدالقادر جو اس جلسے میں موجود تھے۔ نواب صاحب کی اس تقریر کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ

۱۔ الطاف حسین حالی حیاتِ جاوید (آئینہ ادب لاہور ۱۹۶۶ء) ص ۱۶۳

"محسن الملک نے اس جلسے میں جس جوش و خروش سے تقریر کی اس کی نظیر پہلے میں نے نہیں دیکھی تھی۔ یوں سمجھیئے کہ الفاظ کا ایک لاوا تھا جو ابل ابل کر پہاڑ میں سے نکل رہا تھا آخر میں نواب محسن الملک نے کہا کہ اگر حکومت اردو زبان کو مٹانے پر تل ہی گئی ہے تو بہت اچھا ہم اُردو کی لاش کو گومتی میں بہا کر خود بھی ساتھ ہی مٹ جائیں گے اور ایک والہانہ انداز میں یہ شعر پڑھا۔

چل ساتھ کہ حسرت دِل محروم سے نِکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے (۱)

نواب محسن الملک اور دیگر زعماء کی کوششوں سے ہندوؤں کو اپنے مشن میں ناکامی ہوئی لیکن کانگرس کے اس دو سالہ دورِ اقتدار میں کانگرس اور ہندوؤں کو یہ سنہری موقع ہاتھ آیا کہ وہ اردو کے خلاف نصف صدی سے جاری شدہ مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں یہ لسانی مسئلہ اب سراسر سیاسی نوعیت اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ کانگرس نے اردو زبان کی طرف نظرِ عنایت شروع کی اور ایک مردہ زبان میں دوبارہ جان ڈالنے کے درپے ہو گئے۔

اُردو زبان کا مسئلہ نہ صرف ایک لسانی اور سیاسی مسئلہ تھا بلکہ اب اس کی مذہبی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہو چکی تھی جس کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دینی لٹریچر کا ایک خاصا حصہ عربی اور فارسی سے ترجمہ ہو کر اردو زبان میں منتقل ہو چکا تھا۔ اس لیے اردو زبان کو نقصان پہنچنے کی صورت میں دینی لٹریچر پر بھی زد پڑتی تھی۔ اسی امکان کے پیش نظر مولانا اشرف علی تھانوی نے اُردو زبان کی حمایت میں ایک فتویٰ جاری کیا۔ مولانا تھانوی نے اپنے اس فتویٰ میں اس خدشے کا اظہار کیا کہ "اگر خدانخواستہ یہ زبان (اردو) ضائع ہو گئی

۱۔ عاشق حسین بٹالوی چند یادیں چند تاثرات (آئینہ ادب لاہور ۱۹۶۹ء) ص: ۴۳-۴۴۔

تو مسلمانوں نے تمام اسلامی ذخیرہ ضائع ہو جائے گا۔ وہ تمام دینی کتابیں جو فارسی یا عربی میں تھیں اب ان کا اردو میں ترجمہ ہو گیا ہے اس لیے اگر یہ زبان ضائع ہو گئی تو مسلمانوں خاص طور پر عوام مسلمین کے لیے تو علم دین کا کوئی ذریعہ ہی باقی نہ رہے گا۔ تو کیا کوئی مسلمان یہ برداشت کر سکتا ہے کہ یہ ذخیرہ ضائع ہو جائے۔" مولانا نے اپنے فتویٰ میں اردو زبان کی حفاظت کو دین کی حفاظت کے مترادف قرار دیا اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ "اردو زبان کی حفاظت حسبِ استطاعت واجب ہوگی اور باوجود قدرت کے اس میں غفلت اور سُستی کرنا موجبِ مواخذہ آخرت ہوگا۔" (۱)

۱۹۳۸ء میں مولانا تھانوی نے آل انڈیا مسلم لیگ کے پٹنہ اجلاس میں مسلمانانِ ہند کے نام ایک پیغام لکھ کر بھیجا تھا۔ اس پیغام میں بھی آپ نے مسلمانوں اور بالخصوص مسلم لیگ پر زور دیا کہ وہ اردو زبان کے تحفظ کے لیے بھرپور کوشش کریں۔ مولانا کے نزدیک کانگرس کا مقصد اردو زبان کو فنا کر کے ہندی زبان کو رائج کرنا تھا اور "اس کی تہ میں وہی جذبہ کام کر رہا تھا جس کی بنا پر انگریزوں نے ہندوستان میں انگریزی زبان کو رائج کرنا چاہا تھا۔" مولانا کی رائے میں کانگرس کی یہ چال مسلمانوں میں "ذہنی انقلاب" پیدا کرنے کے لیے چلی گئی تھی تاکہ ان کو متحدہ قومیت کے سانچے میں ڈھالنے کی راہ ہموار ہو سکے۔ اپنے بیان میں مولانا نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ "اُردو ہندی کا جھگڑا محض مسلمانوں کو فنا کرنے اور ان میں ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لیے اٹھایا گیا ہے۔" (۲)

اس طرح کانگرس کی اس مسلم کش پالیسی کے خلاف مولانا کے فتوے نے مسلمانوں کو

۱۔ مولانا اشرف علی تھانوی امداد الفتاویٰ (ادارہ اشرف العلوم کراچی) جلد چہارم ص ۶۰۷-۶۱۱

۲۔ مولانا اشرف علی تھانوی خطاب بہ مسلم لیگ (بھارت الیکٹرک پریس سہارن پور، ۱۳۵۷ھ) ص ۱۴

ذہنی طور پر بیدار کرنے میں بہت ممد ثابت ہوئے۔

پرارتھنا اور دیگر غیر اسلامی رسومات

کانگریس نے چند صوبوں میں حکومت سنبھالنے کے بعد یہ سمجھا کہ ہندو راج قائم کرنے کا وقت آن پہنچا ہے اس لیے اس نے بہت سے ایسے اقدامات کیے جن کا مقصد محض مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کو نقصان پہنچانا تھا۔ بندے ماترم کا ترانہ جو کہ مسلم دشمنی کی علامت اور مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ تھا کانگریس کا قومی ترانہ قرار پایا۔ اسمبلیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی کارروائی کا آغاز اس ترانے کو دہرانے سے کیا جانے لگا۔ مسلمان بچوں کے لیے گاندھی کی تصویر کے سامنے پرارتھنا کرنا لازمی قرار پایا۔ چونکہ یہ معاملات براہ راست مسلمانوں کے مذہبی عقائد سے متعلق تھے۔ اس لیے ان صوبوں کے مسلمانوں نے مولانا تھانوی کی طرف رجوع کیا اور آپ سے ان مسائل پر شرعی رائے طلب کی۔ پٹنہ شہر کے چند مسلمانوں نے ۲۰ ستمبر ۱۹۳۸ء کو مولانا تھانوی کو ایک خط لکھا جس میں پرارتھنا کی شرعی حیثیت کے متعلق آپ کی رائے دریافت کی گئی۔ اس خط میں کہا گیا "جلسہ بورڈ ۱۱ ستمبر ۱۹۳۸ء کو چند ممبر صاحبان بورڈ نے یہ تحریک پیش کی کہ جملہ مدارس زیر اہتمام بورڈ میں منسلکہ پرارتھنا متعلق قومی ترنگا جھنڈا روزانہ مدارس کے شروع کیے جانے پر کی جائے۔ اس پر جملہ مسلمان ممبران نے اعتراض کیا کہ ہمارا مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ سوائے خداوند کریم کے کسی دوسرے شخص کے روبرو پرارتھنا کی جائے اور اگر بورڈ کثرت رائے سے پرارتھنا کرنی منظور کرتا ہے تو مسلمان طلبہ کو اس سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ اس پر بذریعہ رزولیوشن ۲۱۳ میں یہ طے کیا ہے کہ اس مسئلہ پر آپ کی رائے لی جائے۔ لہٰذا آپ مہربانی فرما کر اس مسئلے پر جلد از جلد اپنی رائے سے مطلع فرمائیں

کہ آیا جھنڈے کے سامنے پرارتھنا کرنی جائز ہے یا نہیں؟

مولانا تھانوی نے نہایت واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اس مسئلے سے متعلق شرعی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ان مسلمان ممبران کے اعتراض کو صحیح اور جائز قرار دیا۔ مولانا نے فتویٰ جاری کیا کہ "واقعی مذہب اسلام اس قسم کی اجازت نہیں دیتا۔ نہ تو اس جھنڈے کی تعظیم شرعاً جائز ہے اور نہ اس ترانہ کی اور نہ ایسے جلسوں میں شرکت کی اجازت ہے"[1]

واردھا سکیم

کانگریس شروع ہی سے اس بات پر زور دیتی چلی آتی تھی کہ ہندوستان میں صرف قوم آباد ہے اور وہی تمام ہندوستان کی نمائندگی کرتی ہے۔ ادھر مسلمانوں نے ہمیشہ کانگریس کے اس بے بنیاد دعویٰ کو چیلنج کیا اور مختلف اوقات میں اپنے ایک علیحدہ قوم ہونے کا ثبوت فراہم کرتے رہے۔ سیاسی میدان میں شکست کھانے کے بعد کانگریس نے تعلیم کے لبادے میں مسلمانوں کو متحدہ قومیت کے دھارے میں ڈالنے کی چال چلی چنانچہ اس نے حکومت سنبھالنے کے بعد ایک تعلیمی سکیم تیار کی جس کو "واردھا تعلیمی سکیم" کا نام دیا گیا۔ یہ سکیم گاندھی کی براہ راست راہنمائی اور زیر ہدایت مرتب کی گئی تھی[2]۔ یہ سکیم جو کانگریس کے سیاسی پروگرام کا ایک حصہ تھی۔ مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کو تہس نہس کرنے کی غرض سے تیار کی گئی تھی۔ کانگریس کا مدعا تھا کہ اس سکیم کے ذریعے مسلمانوں کی ایک ایسی نسل تیار کی جائے جو اسلامی تہذیب و تمدن، ثقافت، مذہب اور اپنے مذہبی شعار سے بالکل

(۱) امداد الفتاویٰ جلد چہارم ص ۶۰۱ - ۶۰۲

(۲) خورشید مصطفیٰ رضوی حیات ذاکر حسین (مکتبہ برہان دہلی ۱۹۶۹) ص ۹۸

بیگانہ ہو۔ معصوم بچوں کے ذہنوں میں یہ بات نقش کردی جائے کہ مسلم ثقافت ہندو ثقافت کے آگے ہیچ ہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر ایسی نصابی کتب تیار کرائی گئیں جن میں مسلم ثقافت کو مسخ کرکے پیش کیا گیا۔ یہ کتابیں اسلامی تعلیمات کے منافی عقائد مثلاً عدم تشدد، وطن پرستی اور موسیقی سے متعلق موضوعات سے پُر تھیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے دیگر زعماء کی زندگی اور تعلیمات کو ان کتابوں میں اس انداز سے پیش کیا گیا تھا کہ طلباء کے دلوں سے ان کی عظمت، وقار اور احترام ختم ہوجائے۔ مسلم ثقافت کو جان بوجھ کر معمولی انداز میں پیش کیا گیا۔ غرض کہ یہ سیاسی سکیم جس کو تعلیم کا لبادہ پہنایا گیا تھا مسلمانوں کو محض متحدہ قومیت کے جال میں آمادہ کر ان کے ملی تشخص کو ختم کرنے کی ایک سازش کے سوا کچھ نہ تھا۔

مسلمان ہندوؤں کی اس چال سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس لیے انہوں نے پورے شد و مد کے ساتھ اس نام نہاد تعلیمی سکیم کی نہ صرف مذمت بلکہ مخالفت کی۔ مسلمانوں کی تمام سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں آل انڈیا مسلم لیگ، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور جمعیت العلماء ہند وغیرہ نے اس سکیم کی مخالفت کی۔ اس سلسلے میں آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے ۱ر جولائی ۱۹۳۹ء کو بمبئی میں قائد اعظم محمد علی جناح کی زیر صدارت واردھا سکیم سے متعلق ایک قرارداد منظور کی جس کے ذریعے مسلم لیگ نے اس سکیم کو قطعی طور پر مسترد کر دیا۔ مسلم لیگ کے نزدیک اس سکیم کا مقصد مسلم کلچر کو بتدریج تباہ کرکے اس پر ہندو کلچر کو غالب کرنا تھا۔"[1] علامہ سید سلیمان ندوی نے کانگرس کی اس نام نہاد تعلیمی سکیم کو "اقلیتوں

Liaquat Ali Khan Resolutions of the All India Musl1n League Dec.1938-March 19ㄐ0 pp.14-1

پر اکثریت کو روغن چڑھانے کی ایک کوشش قرار دیا۔"[1] کانگرس کی حامی جمعیت العلماء ہند نے بھی اس سکیم کو نہ صرف مسترد کر دیا بلکہ مولانا احمد سعید نے ۹ مارچ ۱۹۳۹ء کو دہلی میں جمعیت کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے یہ دھمکی دی کہ اگر کانگرس نے اسکیم کو مکمل طور پر نافذ کیا تو جمعیت سول نافرمانی سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ جمعیت کے نزدیک اگرچہ اس سکیم میں بہت سی قابل اعتراض باتیں موجود تھیں لیکن اس کے نزدیک سب سے زیادہ قابل اعتراض جزو عدم تشدد کے اصول کو تسلیم کرنے پر زور دینا تھا۔ جمعیت نے سکیم کے اس پہلو کو بھی غیر اسلامی قرار دیا جس کے تحت تمام مذاہب کو ایک ہی سطح پر رکھا گیا تھا۔[2]

مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی تعلیمی سکیم کا تفصیلی مطالعہ کیا اور اس سکیم کو مسلمانوں کے لیے نہایت مضر اور ان کی "رہی سہی مذہبی زندگی" کے لیے سم قاتل قرار دیا۔ آپ نے مغربی تعلیم اور واردھا سکیم کے موازنہ کے بعد واردھا تعلیمی سکیم کو مسلمانوں کے لیے مغربی تعلیم سے زیادہ مہلک اور مضر بتلایا جس کے پردے میں ہندومت کی تعلیم و اشاعت کی صاف جھلک نظر آرہی تھی۔ اس سکیم پر تنقید سے قبل مولانا نے ایک اصولی نکتہ کی وضاحت کی کہ "مسلمان فطرتاً اور مذہباً مروت، رواداری اور حسن معاشرت پر مجبور ہے وہ غیر مسلم کے ساتھ صلح و آشتی، پابندی عہد اور حسن معاشرت کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا ہے لیکن اپنے امتیازی نشانات اور خصوصی تعلیم کو مٹا کر غیر مسلموں میں خلط ملط اور اس طرح گڈمڈ نہیں ہو سکتا کہ ان کا ہم خیال و ہم رنگ ہو جائے۔ نہ اس کو مذہب اس کی اجازت دیتا ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ جب تک کسی قوم میں یہ مذہبی احساس باقی ہے ایسی

۱۔ ہندی اردو تنازع ص : ۳۰۲

۲۔ روزنامہ انقلاب لاہور ۹ مارچ ۱۹۳۹ء ص ۵

کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس اصولی بحث کے بعد مولانا تھانوی نے اس سکیم کے چند اہم نکات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ عدم تشدد یا اہنسا اس سکیم کا بنیادی اصول تھا۔ مولانا نے عدم تشدد کے فلسفہ کو "گاندھی فلسفہ" قرار دیتے ہوئے اس طرز فکر کی سخت مذمت کی اور کہا کہ اس سے زیادہ فرقہ پرستی کیا ہو سکتی ہے کہ تمام ملک کے بچوں کو گاندھوی فلسفہ پر مجبور کیا جائے۔

اس سکیم کے تحت تعلیمی کتب اس نہج پر تیار کی گئی تھیں کہ طلباء کے ذہن پر یہ بات نقش ہو جائے کہ تمام آسمانی مذاہب سچے ہیں۔ مولانا کے خیال میں ایسا کرنا خود کو لامذہبیت کے گڑھے میں گرانے کے مترادف ہوگا۔ اس لیے کہ انسان تمام مذاہب کی عزت اسی وقت کر سکتا ہے جب کہ سب کو سچا سمجھے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بالکل لامذہب ہو جائے گا۔ مولانا نے اس طرز فکر کی مذمت کی اور ساتھ ہی اس بات کی سفارش کی کہ ملک کی اجتماعی زندگی کو خوشگوار اور پُرامن بنانے کے لیے باہمی رواداری، ہمسایہ قوموں کے حقوق اور انسانی حقوق کی تعلیم دی جائے لیکن ساتھ ہی ایسے غلط قصوں کو بھی نابند کیا جائے جس میں مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکایا گیا ہو۔ آخر میں موسیقی کی تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے مولانا نے اس کو مذہب کے منافی قرار دیا اور مسلمانوں کے بچوں کو موسیقی کی جبری تعلیم کو ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت قرار دیا۔

بندے ماترم کا ترانہ ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف گویا ایک قسم کا اعلانِ جنگ تھا۔ دوسری طرف یہ ترانہ "شرکیات" پر مشتمل تھا اس لیے مسلمانوں کی جانب سے اس کو برداشت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مولانا تھانوی نے اس ترانہ پر بھی کڑی نکتہ چینی کی۔ [1]

---

(۱) روزنامہ عصر جدید کلکتہ ۲۶ دسمبر ۱۹۳۸ء۔ ص ۱

مسلم لیگ کے نام پیغام میں بھی مولانا تھانوی نے واردھا تعلیمی سکیم کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے خطرہ قرار دیتے ہوئے مسلم لیگ کے زعماء کو متنبہ کیا کہ وہ اس سکیم کی جانب سے غفلت نہ برتیں۔ مولانا کی رائے میں یہ سکیم اپنی ظاہری صورت میں جس قدر بے ضرر نظر آتی تھی۔ اندرونی طور پر اسی قدر مسموم اور زہر آلود تھی۔ مولانا کے نزدیک یہ سکیم متحدہ قومیت کے علمبرداروں کی ایک چال تھی جس کے ذریعے وہ مسلمانوں میں سے مذہبی روح نکالنا چاہتے تھے۔

اس سکیم کی تیاری کے وقت اس کے مرتبین کے ذہنوں پہ ایک بات سوار تھی کہ یہ ثابت کیا جائے کہ سچائی تمام سماوی مذاہب میں موجود ہے اور اصولی اعتبار سے ہر مذہب سچا ہے اور کسی کو کسی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ مولانا نے اپنے بیان میں اس نظریہ پر کڑی نکتہ چینی کی کہ اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چونکہ سچائی تمام مذاہب میں موجود ہے اور یہی ذریعہ نجات ہے اور نجات ہی کے واسطے مذہب کو اختیار کیا جاتا ہے تو اس کے لیے خاص مذہب کی ضرورت نہیں مسلمان رہو یا ہندو ہو جاؤ یا عیسائی ہو جاؤ۔ مولانا نے مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہوئے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اگر واردھا سکیم ہندوستان میں رائج کر دی گئی تو مسلمانوں کا مذہب باقی نہیں رہے گا۔ مولانا نے قائدین لیگ سے اس سکیم کی پُرزور مخالفت کی اپیل کی۔ [1]

۱۸ ستمبر ۱۹۳۸ء کو مولانا نے کانگرس کی بدنظمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مجلس میں فرمایا کہ "انگریزوں کو حکومت کرتے ہوئے مدت گزر گئی ہے۔ تحمل اور دور اندیشی کی عادت ہو گئی ہے وہ ہوش سے کام لیتے ہیں اور چونکہ کانگرس کی حکومت نئی نئی بنی ہے اس لیے جوش زائد ہے اور تشدد اور سختی سے کام لے رہے ہیں۔ ان کی ذہنی حالت ہے جو

---

(۱) پیغام مسلم لیگ ص ۱۳-۱۴

اس آیت میں بیان کی گئی ہے ۔ واذا تولی سعی فی الارض لیفسد فیھا ویھلک الحرث والنسل واللہ لا یحب الفساد " یعنی جب منافق کو حکومت مل جاتی ہے تو وہ اس دوڑ دھوپ میں لگا رہتا ہے کہ دنیا میں فساد کرے اور زراعت اور مویشی ہلاک کرے۔ تولّی کے دو معنی ہیں ایک پیٹھ پھیرنے کے اور دوسرے حاکم بننے کے ۔ مَیں نے دوسرے ہی معنی کے لحاظ سے تشبیہ دی ہے۔ کانگرس کو چاہیئے تھا کہ اتفاق سے جو موقع ہاتھ آگیا تھا اس کو غنیمت سمجھتی اور دل جوئی اور مراعات سے حکومت کرتی مگر اس سے ایسا نہ ہو سکا حتیٰ کہ خود اس کے حامی بھی اس کی موجودہ روش کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھ رہے ہیں (۱)

مولانا تھانوی نے کانگرس کے دَورِ حکومت کے بارے میں جو رائے قائم کی خود گاندھی نے حرف بحرف اس کی تائید کرتے ہوئے اخبار ہریجن (۲۸ جنوری ۱۹۳۸ء) میں لکھا کہ "میں کانگرس کے موجودہ دَورِ حکومت میں سوائے طوائف الملوکی اور انقلابی تباہی کے کچھ نہیں دیکھتا۔" (۲)

۱۔ اسعد الابرار ص ۱۴۹

۲۔ نواب صدیق علی خاں بے تیغ سپاہی (الائنز بک کارپوریشن کراچی ۱۹۷۱) ص ۱۳۵

باب ۳

مولانا تھانوی اور آل انڈیا مسلم لیگ

مسلمانانِ پاک و ہند نے سر سید احمد خان کے صائب سیاسی نظریات کو قبول کرتے ہوئے سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی تھی مگر ان کی وفات کے بعد چند ایک واقعات نے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ سر سید کے راستے کو خیرباد کہہ کر اپنے حقوق کے تحفظ کی خاطر سیاسی میدان میں اتریں۔ چنانچہ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو مسلمانوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے ایک سیاسی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سیاسی جماعت کے اہم مقاصد میں مسلمانوں کے سیاسی و دیگر حقوق کا تحفظ، انگریزوں کی وفاداری اور ہمسایہ قوموں سے اچھے تعلقات قائم کرنا شامل تھے ۔

آل انڈیا مسلم لیگ ابتدائی دَور میں کوئی عوامی جماعت نہیں تھی اور اس کا کام محض سال میں ایک مرتبہ ایک جلسہ کی کارروائی تک محدود تھا۔ ۱۹۳۵ء کے بعد جب قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کا کام شروع کیا تو مسلمانوں نے لیگ کی طرف رجوع کیا چونکہ اب عام مسلمان بھی لیگ کی کارروائیوں میں دلچسپی لے رہے تھے اس لیے لیگ میں شمولیت یا عدم شمولیت کے بارے میں شرعی نقطہ نظر کا سوال زیرِ بحث آیا۔ چونکہ مسلمان لیگ اور کانگرس کے متعلق علماء کی رائے جاننے کے خواہش مند تھے اور مولانا تھانوی کی طرف بھی رجوع کر رہے تھے اس لیے مولانا تھانوی نے صورتِ حال سے

آگاہی کی خاطر آل انڈیا مسلم لیگ اور جمعیۃ العلماء ہند کو کچھ سوالات لکھ کر بھیجے تاکہ کسی بھی جماعت کے حق میں فتویٰ دینے سے قبل صحیح صورتِ حال معلوم ہو سکے۔ یہ سوالات مولانا ظفر احمد عثمانی نے مرتب کیے تھے اور مولانا تھانوی کی اصلاح کے بعد دونوں جماعتوں کو بھیجے گئے تھے۔

سوالات از جمعیۃ العلماء ہند

۱۔ جمعیۃ العلماء ہند کے نزدیک مذہبی حیثیت سے کانگرس میں شرکت کیوں ضروری ہے اور کانگرس سے علیحدگی میں کیا ضرر ہے۔

۲۔ کانگرس میں مسلمانوں کا داخلہ جس صورت انفرادی، غیر منظم اور غیر مشروط طریقہ پر اس وقت ہو رہا ہے اور مسلم نشستوں کے لیے کانگرس خود براہ راست امیدوار تجویز کرتی ہے کیا اس سے اسلام اور مسلمانوں کو خطرہ نہیں۔ اگر ہے تو اس خطرہ سے بچنے کی کیا صورت ہے۔

۳۔ مسلم لیگ سے جمعیۃ العلماء کو کیوں اختلاف ہے جبکہ وہ مسلمانوں کو منظم کر رہی ہے اور اس کا مقصد بھی آزادی کامل کی تحصیل ہے جیسا کہ اس سال لکھنؤ کے اجلاس میں اس نے اعلان کر دیا ہے۔

۴۔ اگر مسلم لیگ میں کچھ مفاسد اور منکرات شرعیہ موجود ہیں تو کیا یہ صورت ممکن نہیں کہ جمعیۃ العلماء مسلم لیگ میں شریک ہو کر اس کو مخلص اور فعال لوگوں سے بھر دے اور مسلمانوں کی تنظیم کو مکمل مفاسد اور منکرات سے پاک کر دے۔

۵۔ کیا مسلم لیگ اور جمعیۃ العلماء ہند کے تصادم سے مسلمانوں میں تشتت و افتراق پیدا نہیں ہوتا اور کیا یہ تشتت مضر نہیں۔ اگر ہے تو جمعیۃ العلماء نے اس مرض کے

انسداد کی کوئی صورت اختیار کی ہے یا نہیں۔

دُوسروں کے شبہات اور اعتراضات

۱۔ کانگرس کے ساتھ مل کر جو آزادی ہندوستان کو حاصل ہوگی اس کا انجام ایک مشترکہ حکومت کا قیام ہے جس میں عنصرِ کفر غالب اور عنصرِ اسلام مغلوب ہوگا۔ ایسی حکومت یقیناً اسلامی حکومت نہ ہوگی تو اس کے لیے جدوجہد کرنا مسلمانوں کے ذمے کس دلیل سے واجب ہے۔ نیز اس کی ضمانت کیا ہے کہ ہندو انگریزوں کو ہندوستان سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی مسلمانوں پر حکومت کرنا نہیں چاہتے۔ کانگرس کے اقتدار سے اس وقت ہندوؤں کے حوصلے جس قدر بڑھنے لگے ہیں اور وہ مسلمانوں پر بازاروں، دیہاتوں، ملازمتوں اور سرکاری محکموں میں جو مظالم برپا کرنے لگے ہیں۔ جمعیۃ نے ان کے انسداد کی کیا تدبیر سوچی ہے اور اس کے لیے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے یا نہیں۔

۲۔ کانگرسی وزارتوں نے زمینداروں کی اراضی کاشت کاروں کی ملکیت بنا دی ہے۔ جمعیۃ نے اس سلسلے میں کیا کیا ہے۔

۳۔ کانگرس میں بندے ماترم کا ترانہ گایا جاتا ہے جو تفوق شرکیہ پر مشتمل ہے اور قومی جھنڈے کو سلامی دی جاتی ہے جو قریب بہ شرک ہے۔ کانگرسی مسلمان بھی بندے ماترم کے گیت کے وقت کھڑے ہو جاتے ہیں اور قومی جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں۔ کیا ان افعال میں شرکت گناہ نہیں ہے۔ اگر ہے تو جمعیۃ نے مسلمانوں کو اس کے متعلق کیا ہدایات کی ہیں اور اس پر اور اسی قسم کی دوسری منکرات پر صدائے احتجاج بلند کی ہے

یا نہیں ۔

۴۔ صدر کانگریس اور اس کی ہم خیال جماعت جو اشتراکیت کی حامی اور مذہب اور خدا کی دشمن ہے ان کی تقاریر خدا اور مذہب کے خلاف شائع ہوتی رہتی ہیں ۔ جمعیۃ نے ان کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند کی ہے کہ نہیں اور مسلمانوں کو ایسے کافروں کی تعظیم و تکریم سے روکا ہے کہ نہیں۔

۵۔ کانگریس کے ساتھ مل کر جو آزادی حاصل ہوگی اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس میں مسلمانوں کے مذہبی و سیاسی حقوق کی پوری حفاظت ہوگی جبکہ کانگریس اور اس کے ذمہ داران مذہب اور حقوق کا نام لینا بھی جرم سمجھتے ہیں اور اس کو فرقہ پرستی قرار دیتے ہیں نیز جمعیۃ نے کانگریس کے ساتھ تعاون کر کے مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی حقوق کے تحفظ میں اس وقت تک کیا کام کیا ہے۔

۶۔ جمعیۃ نے اچھوت قوموں میں تبلیغ اسلام کیلئے کوئی قدم اٹھایا ہے کہ نہیں جس کی مذہباً و سیاستاً سخت ضرورت ہے۔

مولانا تھانوی کے مندرجہ بالا سوالات کے جوابات متعدد یاد دہانیوں کے بعد جمعیۃ العلماء کی طرف سے موصول نہ ہوئے ۔(۱)

سوالات از مسلم لیگ

۱۔ آپ کے نزدیک کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت سیاسی حیثیت سے کیوں مضر ہے اور اس سے علیحدگی کیوں ضروری ہے اکثر لوگ پوچھتے ہیں تو ہم ناواقفیت کی وجہ

(۱) افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص: ۵۳ - ۵۶

سے جواب نہیں دے سکتے ۔

۲۔ کیا بدون کانگریس کے تعاون کے ہندوستان کو آزادی مل سکتی ہے ۔ اگر مل سکتی ہے تو اس کی صورت جو آپ کے ذہن میں ہو اس کو واضح فرمایا جائے ۔

۳۔ کیا کانگریس سے مسلمانوں کی علیحدگی آزادی ہندوستان کے مسئلے میں باعث تعویق و تاخیر نہ ہوگی ۔

۴۔ کیا مسلم لیگ تمام مسلمانوں کو یا ان کی زیادہ تعداد کو کانگریس میں شریک ہونے سے روک سکتی ہے ۔ بظاہر یہ امر مستبعد ہے ۔ کانگریس میں پہلے ہی سے مسلمان موجود ہیں اور جب سے وہ وزارت قبول کر کے برسر اقتدار آئی ہے وہ زیادہ تعداد میں شریک ہو رہے ہیں ۔ پس اگر مسلم لیگ نے تھوڑے سے مسلمانوں کو روک بھی لیا تو کیا نفع کی امید ہے جبکہ زیادہ حصہ اس میں شریک ہوگا ۔

۵۔ کیا مسلم لیگ کے زیادہ تر ارکان انگریزوں کے حامی اور اندرونی طور پر ان کے بہی خواہ نہیں ہیں اور کیا بقول سر اکبر حیدری مسلم لیگ ایک برطانوی زہر ہے (مدینہ بجنور ۱۳ دسمبر ۱۹۳۷ء) اگر نہیں تو اس کا اطمینان بخش جواب دیا جائے ۔

۶۔ مخالفین کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ ایک بے عمل جماعت ہے ۔ کانگریس کی طرح اس نے اب تک کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا ہے نہ مسلمانوں کے فائدہ کے لیے کوئی کام کیا ہے ۔ اور اس وقت کانگریس کے مقابلے میں جو جد و جہد الیکشن لڑنے میں صرف کر رہی ہے مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ انگریزوں کا نفع ہے کہ کانگریس کی قوت کمزور ہو کر آزادی ہندوستان کا مسئلہ تعویق میں پڑ جائے ۔ اس اعتراض کا کیا جواب ہے ۔

۷۔ مسلم لیگ نے اب تک مسلمانوں کی تنظیم اور ان کی مذہبی، تمدنی اور اقتصادی ترقی کے لیے کیا طریقِ عمل اختیار کیا اور اس کے لیے کونسا عملی قدم اٹھایا۔

۸۔ اگر کسی وقت ہر طرح اطمینان کر کے مسلم لیگ کو کانگرس میں شامل کرنے کی ضرورت ہوئی تو کیا مسلم لیگ کو توڑ کر اس میں شامل کر لیا جائے گا یا مسلم لیگ کو قائم رکھا جائے گا۔

۹۔ اگر علما مسلم لیگ کے ممبر بننا چاہیں تو کیا ان کو بھی الیکشن ہی کے ذریعے مسلم لیگ کا کوئی درجہ حاصل ہوگا جس سے ان کو مسلم لیگ کے اجلاس اور مجلسِ عاملہ وغیرہ میں اپنی رائے پیش کرنے کا حق حاصل ہو۔ مسلم لیگ میں علمار کی وقعت کس درجہ ہوگی اور بصورتِ اختلاف علمار کسی مسئلہ مختلف فیہ کو کس طرح طے کیا جائے گا۔

۱۰۔ جمعیتہ العلمار ہند اور مسلم لیگ کے تصادم سے مسلمانوں میں جو تشتت و افتراق پیدا ہوگا آیا لیگ نے اس کے ضرر کو محسوس کیا ہے یا نہیں۔ اگر کیا ہے تو اس کے انسداد کی کوئی صورت باہمی اتفاق کی سوچی ہے۔

۱۱۔ مسلم لیگ نے اچھوت قوموں میں تبلیغ اسلام کی ضرورت کو محسوس کیا ہے کہ نہیں جو نہ صرف مذہباً بلکہ سیاستاً بھی نہایت اہم ہے۔ اگر کیا ہے تو اس کے لیے کوئی عملی قدم بھی اٹھایا ہے کہ نہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے نواب محمد اسمٰعیل خان ایم ایل اے صدر مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ یوپی اور سید حسن ریاض نے باہمی مشورہ کے بعد ان سوالات کے جوابات تیار کیے اور سید ذاکر علی جوائنٹ سیکرٹری یوپی مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ نے ۲۵ ردسمبر ۱۹۳۷ء کو مولانا تھانوی کو ارسال کر دیے۔

سید حسن ریاض سابق مدیر منشور جنہوں نے جوابات مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کیا راقم کو ایک خط میں ان سوالات کے متعلق لکھا کہ "مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم نے ۱۹۳۷ء میں صدر یوپی مسلم لیگ کو جو کہ اس وقت نواب محمد اسمٰعیل خان مرحوم تھے، ایک خط لکھا جس میں گیارہ یا بارہ سوالات تھے۔ یہ سب سوالات مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد اور دین کے معاملہ میں مسلم لیگ کی روش کے متعلق تھے میں غالباً مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے جلسے کے سلسلے میں لکھنؤ گیا ہوا تھا۔ نواب اسمٰعیل خان بھی اسی غرض کے لیے لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور سلیم پور ہاؤس میں مقیم تھے۔ نواب صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ مولانا کے خط کا جواب دے دیں۔ سید ذاکر علی مرحوم نے جو یوپی مسلم لیگ کے سیکرٹری تھے وہ خط مجھے دیا اور میں نے وہیں مولانا کے سوالات کا جواب لکھ کر نواب صاحب کو دے دیا۔ انھوں نے میرے جواب سے اتفاق کر کے وہ خط مولانا مرحوم کو بھیج دیا۔ اس کے جواب میں مولانا نے صدر یوپی مسلم لیگ کو ایک اور خط لکھا جس میں ان جوابات پر اپنے اطمینان کا اظہار فرمایا اور مسلم لیگ کی تائید کا وعدہ کیا" (۱)

مرحوم سید حسن ریاض نے اپنی کتاب میں بھی اس معاملے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا "علمار ابتدار سے مسلم لیگ کے ساتھ تھے اور ہر مکتب خیال کے علمار۔ یہ خیال صحیح نہیں کہ جمعیت العلمار ہند جو کانگرس کے ساتھ تھی تو ہندوستان کے تمام علمار کانگرس کے ساتھ تھے۔ جمعیتہ العلمار ان تھوڑے سے مولویوں کے گروہ کا نام تھا جس کو خلافت ایجی ٹیشن میں سیاست سے لگاؤ پیدا ہوا اور بعد کو کانگرس کے رویے سے سیاسی سرگرمیاں جاری رکھنا ان کو سہل معلوم ہوا۔ وگرنہ ان کے علاوہ بھی ہندوستان میں بہت سے علمار تھے اور بڑے مرتبہ کے علمار۔ مسلم لیگ کی تحریک کے آغاز ہی میں مولانا اشرف علی تھانوی نے صوبہ مسلم لیگ

۱۔ مکتوب سید حسن ریاض بنام راقم ۱۵ ر مارچ ۱۹۶۸ء۔

یوپی کے صدر کو جو نواب اسماعیل خاں مرحوم تھے۔ ایک استفسار بھیجا جس میں غالباً گیارہ سوالات تھے۔ یوپی مسلم لیگ کی طرف سے اس کا جواب دیا گیا۔ حضرت مولانا مرحوم کو بالکل اطمینان ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے دائرہ اثر کے لوگوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ مسلم لیگ میں شریک ہوں جس میں بہت سے صاحب مرتبہ علماء بھی تھے۔"(۱)

جواب از جانب زعمائے مسلم لیگ

جواب نمبر ۱، بحث یہ ہے کہ مسلمان اجتماعی حیثیت سے کانگرس کے ساتھ تعاون کریں یا انفرادی حیثیت سے کانگرس میں داخل ہو جائیں۔ ہمارے خیال میں سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کی انفرادی شرکت اس لیے مضر ہے کہ مسلمان اقلیت میں ہونے کی وجہ سے کانگرس میں ہمیشہ اس قدر کم تعداد میں رہیں گے کہ کانگرس کے مسلک اور عمل پر ان کی رائے کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ نیز مسلمان ارکان کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے مسلمان آل انڈیا کانگرس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی میں جو کانگرس کے واقعی با اختیار ادارے ہیں شاذ و نادر ہی منتخب ہو سکیں گے۔ کانگرس کی ان دونوں با اختیار کمیٹیوں میں اس وقت تک مسلمانوں کا جو تناسب رہا ہے اس سے اچھی طرح یہ ثابت ہو رہا ہے کہ یہ اندیشہ بالکل صحیح ہے۔ غالباً آل انڈیا کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اکیس ارکان میں سے صرف دو اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے صرف تین سو ارکان میں سے صرف سات یا آٹھ مسلمان ہیں۔ انتخاب مخلوط، نشستوں کا تعین نہیں، کانگرس میں ہندو ووٹروں کی تعداد زیادہ ایسی صورت میں کبھی توقع نہیں کی جا سکتی کہ مسلمان با اختیار کمیٹیوں میں اتنے ہو سکیں گے کہ وہ کانگرس کے فیصلوں اور طرز عمل پر کوئی اثر ڈال سکیں۔ اس سلسلے میں کانگرسی خیال کے مسلمان یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ کثیر تعداد میں کانگرس کے ممبر بنیں اور اس طرح کانگرس پر قبضہ کر لیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ہندو مسلمانوں کے مقابلہ میں باعتبار تعداد زیادہ ہیں اور ہندو عورتیں بھی کانگرس کی ممبر بنتی ہیں اور اس میں شریک ہوتی ہیں۔ مسلمان عورتیں اگر ممبر بن بھی جائیں تو پردے کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکتیں۔ مسلمان زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ اپنی ساری آبادی کو کانگرس کا ممبر بنوا دیں۔ ہندو بھی یہی کریں گے۔ اس صورت میں ہندو مرد اور عورتیں مل کر مسلمان مرد ممبروں سے تقریباً پانچ گنا زیادہ ہو جائیں گے اور کانگرس کی ہر کمیٹی کا فیصلہ انہی کی رائے پر منحصر ہوگا۔ مسلمان کبھی یہ توقع نہیں کر سکتے کہ ان کی کوئی تجویز کانگرس میں منظور ہو سکے گی۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ ان چار صوبوں کی کانگرس میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں یعنی صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ اور بنگال کی ہر کمیٹی میں مسلمانوں کی اکثریت رہے گی۔ یہ بھی ٹھیک ہے مگر دشواری یہ ہے کہ کانگرس کے نظام میں دونوں کو موجودہ انگریزی نظام کی طرح صوبجاتی خود اختیاری حاصل نہیں ہے۔ کانگرس اسی وجہ سے کہ چاروں صوبوں میں مسلمانوں کو با اختیار اکثریت حاصل نہ ہو صوبجاتی خود اختیاری کے خلاف ہے۔ اور مرکزی وحدانی طرز حکومت پر مصر ہے۔ مسلمانوں اور کانگرس کے درمیان یہ مسلسل اختلاف رہا ہے مسلمان اپنی اکثریت کے صوبوں میں جو بات طے کریں گے وہ مرکزی وحدانی طرز حکومت ہونے کی صورت میں کانگرس یعنی آل انڈیا کانگرس کے اجلاس کانگرس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی میں نامنظور ہو جائیں گی جہاں مسلمان ارکان کا تناسب ایک چوتھائی سے زیادہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر مسلمان اس طرح کانگرس میں شریک ہو گئے تو ان کی حیثیت یہ ہوگی کہ ان کی موجودگی میں ان کے مفاد کے خلاف فیصلے ہوں گے اور آئینی اصول کے مطابق ان کو اکثریت کے

۱۔ پاکستان ناگزیر تھا ص ۳۷۵ ۔ ۳۷۶

فیصلوں کو قبول کرنا پڑے گا اور اس کے باوجود کہ وہ سکوت کریں یا اختلاف کریں وہ ان
مخالف فیصلوں کے ذمہ دار تصور کیے جائیں گے اور کانگرس کے باہر بھی ان کو اختلاف
کا کوئی حق نہ رہے گا لیکن اگر مسلمان مسلم لیگ کے ماتحت اپنی علیحدہ تنظیم کریں تو وہ ہندوستان
میں دوسری طاقت ہوں گے جو تعداد کے اعتبار سے کم مگر دوسری حیثیتوں سے اکثریت کے
مقابلے میں زیادہ طاقتور ہو سکتی ہے۔

یقیناً ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک اور اتحاد کے بغیر ہندوستان کا آزاد ہونا
بظاہر ممکن نہیں لیکن یہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا مشترکہ مفاد اور مقصد ہے لہٰذا اگر
کانگرس اخلاص کے ساتھ آزادیِ ہندوستان کی طالب ہے تو اس کو مسلم لیگ کے جائز
مطالبات طے کرنے پڑیں گے اور وہ ہر معاملہ میں مسلمانوں سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوگی۔
انفرادی حیثیت سے کانگرس میں شرکت سے مسلم اقلیت ہندو اکثریت میں گم ہو جاتی
ہے اور جداگانہ تنظیم کی صورت میں مسلمانوں کی اجتماعی قومی انفرادیت قائم رہتی ہے۔ کانگرس
میں شریک ہو کر مسلمان جو بات کہیں گے وہ اکثریت کی طاقتور آواز سے دب جائے گی اور
جو بات وہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کہیں گے وہ جداگانہ ہونے کی وجہ سے ساری دُنیا
میں سنی جائے گی۔ کانگریس میں شریک ہو کر مسلمان اپنے خاص مفاد کے لیے کوئی جداگانہ عمل
نہ کر سکیں گے اور جداگانہ اسلامی تنظیم کے ماتحت ہر عمل ان کے اختیار میں ہوگا۔

جواب نمبر ۲: کانگریس کے تعاون کے بغیر یا دوسرے الفاظ میں ہندوؤں
کے تعاون کے بغیر مسلمان یقیناً ہندوستان کو آزاد نہیں کرا سکتے۔ لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ
کانگرس کا تعاون انہی شرائط پر حاصل کیا جائے جو کانگرس پیش کرے یعنی ہر مسلمان چار
آنے کا ابتدائی ممبر بنے اور انفرادی حیثیت سے بلا مسلم مفاد کے تحفظ کی شرائط منوائے

ہوئے کانگرس میں داخل ہو کر اپنی اسلامی حیثیت کو کم کر دے اور محض ہندوستانی رہ جائے
اس طرح کیوں نہ ہو کہ مسلمان مسلم لیگ کے ماتحت اپنی تنظیم کریں اور مسلمانوں کی انجمن مسلم لیگ اور
ہندوؤں کی انجمن کانگرس کے درمیان تمام مشترکہ مفاد کے حصول کے لیے اور نیز آزادی حاصل
کرنے کے لیے بشرائط اس قسم کا معاہدہ اتحاد ہو جیسا دو حلیف قوموں کے درمیان ہوتا ہے
اہم معاملات کے تصفیہ کے لیے کانگرس کی مجلسِ عاملہ اور مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس
ہوں اور ان اجلاسوں میں جو فیصلے ہوں ان پر دونوں انجمنیں اور دونوں قومیں کاربند ہوں۔
کیا انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنی اپنی قومی انفرادیت کو مٹائے بغیر جرمنی کے خلاف
جنگ نہیں کی۔ کانگرس کا تعاون حاصل کرنے کی دوسری صورت مسلمانوں کے حق میں بہتر
صورت ہے۔ اگر مسلمان مسلم لیگ کو مضبوط اور مستحکم کر لیں اور کانگرس میں شریک نہ ہوں تو
یقیناً کانگرس اس طریقہ پر مسلمانوں سے اتحاد کرنے پر مجبور ہوگی۔

جواب نمبر ۳: کانگرس میں مدغم ہونے کے بعد جب مسلمان یہ دیکھیں گے کہ ان
کی رائے اور آواز بے اثر ہے اور وہ اپنے قومی مفاد کے خلاف ہندوؤں کے پیچھے پیچھے
چلنے پر مجبور ہیں تو ان کا آزادی حاصل کرنے کا جذبہ ان کے دلوں میں سرد پڑ جائے گا اور
آزادی کی تحریک اور جنگ مسلمانوں کی ہمت اور عمل سے اسی طرح محروم ہو جائے گی
جس طرح کہ انگریزی حکومت ہندوستان کے تحفظ کے لیے جنگوں میں ہندوستانیوں کے
طبعی جوشِ مدافعت وطن اور جوشِ ملک گیری سے محروم ہے اور صرف روپیہ دے کر
ان کو لڑنے پر آمادہ کرتی ہے۔ لہٰذا اس طرح حصول آزادی میں تعویق و تاخیر زیادہ ہوگی
لیکن اگر مسلمان مسلم لیگ میں رہے اور ہندو کانگرس میں رہے اور دونوں قوموں کے درمیان
اس طرح اتحاد قائم ہوا جیسا کہ دو قوموں کے درمیان ہوتا ہے اور اگر مسلمانوں کو اطمینان

ہو گیا کہ ان کی اسلامیت اور قومی انفرادیت محفوظ ہے اور آزاد ہندوستان میں وہ بھی آزاد
قوم کی حیثیت سے رہیں گے تو مسلمان اپنے مفاد کے لیے اور ہندو اپنے مفاد کے لیے
حلیفوں کی حیثیت سے خالص وطنی آزادی کے جذبہ سے جنگ کریں گے۔ یہ جنگ جس
قسم کی بھی ہوگی۔ زیادہ طاقتور ہوگی اور اس سے آزادی جلد حاصل ہو سکے گی۔

جواب نمبر ۴: یقیناً مسلم لیگ مسلمانوں کو کانگرس میں شریک ہونے سے
روک سکتی ہے اور باوجود اس کے کہ کانگرس برسر اقتدار ہے اور اس کی وزارت قائم
ہے۔ تجربہ سے ظاہر ہو گیا ہے کہ کانگرس کی حکومت قائم تھی۔ مسلم لیگ نے کانگرس کے
مقابلے میں پانچ الیکشن لڑے ان میں سے چار میں مسلم لیگ کامیاب ہوئی اور صرف ایک
بجنور میں ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی کی وجہ بھی حافظ ابراہیم صاحب کا ذاتی اثر اور مسلم لیگ
کو کام کرنے کی کم مہلت تھی نیز یہ بھی کہ ابھی تک مسلم لیگ کی تنظیم مکمل اور طاقتور نہیں ہے
پھر تاریخی تجربہ یہ بھی بتا رہا ہے کہ اقوام کی اکثریت اپنے مفاد اور وجود کے تحفظ کے حق
میں رہتی ہے حکومت کے مؤید صرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے مفاد براہ راست حکومت
سے وابستہ ہوں۔ مثال کے طور پر کانگرس کی سابقہ تحریکات کو لے لیجیے۔ انگریزوں کی
حکومت قائم تھی۔ ہزارہا ہندو سرکاری ملازم تھے۔ زمیندار خطاب یافتہ اور ٹھیکیدار اور
اجارہ دار وغیرہ تھے مگر قوم کی آواز وہی سنی گئی جو کانگرس کے پلیٹ فارم سے بلند ہوئی۔
لہٰذا جو لوگ ذاتی اغراض کے لیے یا کانگرس کے اقتدار سے مرعوب ہو کر مسلم مفاد کے خلاف
کانگرس میں شریک ہوں گے وہ بھی انگریزی حکومت کے پرستار ہندوؤں کی طرح بے اثر
ہو کر رہ جائیں گے۔ نیز یہ کہ جب مسلم لیگ کا نظام مضبوط ہو جائے گا اور یہ ناممکن ہو جائیگا
کہ کوئی مسلمان انفرادی حیثیت سے یا کانگرس کی طرف سے کھڑا ہو کر مجالس واضعان

قوانین کا ممبر منتخب ہو سکے اور مسلم رائے عامہ کانگرس کا ممبر ہونا عیب اور مسلم لیگ کا ممبر
ہونا اچھا سمجھنے لگے گی تو کوئی مسلمان کانگرس کا ممبر بننا پسند نہ کرے گا اور اس طرح مسلم لیگ
مسلمانوں کو کانگرس میں جانے سے روک دے گی اور بالفرض اگر کوئی چھوٹی سی بے اثر
جماعت کانگرس میں رہی بھی تو کانگرس کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہ ہوگی۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء
سے ۱۹۳۵ء تک یہی ہوا۔ کانگرس ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرقہ وارانہ معاملات کے
متعلق کانگرسی مسلمانوں سے کوئی گفتگو نہیں کرتی تھی بلکہ ہر معاملہ میں ان کو نظر انداز کر کے کانگرس
کو مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس سے رجوع کرنا پڑتا تھا۔ آخر میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ
کانگرس میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ہرگز شامل نہیں۔ اس قسم کے تمام اعلانات جھوٹے اور
بے بنیاد ہیں۔ بعض چند افراد ہیں جو کانگرس میں شریک ہیں۔

جواب نمبر ۵: ۱۹۳۷ء سے مسلم لیگ میں مکمل انقلاب ہوا۔ کامل ذمہ دار
حکومت کی بجائے پورا استقلال یا پوری خود مختاری مطمح نظر قرار پایا ہے۔ محدود رکنیت کی
جگہ دو جنس کی شرط پر رکنیت تمام کی گئی ہے۔ گویا اب مسلم لیگ کانگرس سے زیادہ جمہوری
انجمن ہے۔ ابتدا سے انتہا تک جتنی کمیٹیاں بنیں گی اور جتنے عہدے دیے جائیں گے
وہ انتخابات کے ذریعے ہوں گے۔ اس صورت میں انگریزوں کے خوشامدیوں کے
مسلم لیگ میں دخل کا کوئی امکان نہیں لیکن بالفرض اگر عام مسلمان انگریزوں کے حامی ہیں تو ان
کو کون روک سکتا ہے مگر یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ مسلم لیگ کے تمام موجودہ ارکان کی میعادِ
رکنیت اکتوبر میں ختم ہو رہی ہے۔ نئے انتخابات میں ہر امیر اور غریب کو عام ممبر بننے کے
وقت اس عہد نامہ پر دستخط کرنے پڑیں گے کہ وہ کامل آزادی کا طالب ہے اس کے بعد
وہ انتخاب میں آئے گا اس کے بعد بھی اگر وہ منافقت کرے اور دل میں انگریزوں کا حامی

رہے تو اس پر کسی کو قابو نہیں۔ جیسے کوئی شخص توحید و رسالت وغیرہ کا اقرار کرے ہم اس کو مسلمان ماننے پر مجبور ہیں۔ اس کے دل میں کیا ہے اس پر سوال کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ اس طرح کے منافق لوگ خود کانگرس میں بھی موجود ہیں اور کانگرس انکو اندر آنے سے نہیں روک سکتی۔ سر اکبر حیدری نے مسلم لیگ کو جو برطانوی زہر کہا ہے اس کے معنی بالکل اور ہیں۔ کیا اکبر حیدری نے حیدرآباد میں کانگرس قائم کرنے کی اجازت دے دی ہے اور کیا وہ کانگرس کو تریاق سمجھتے ہیں۔ ہر ہندوستانی ریاست سیاسی تحریکات کو اپنی حدود کے اندر داخل ہونے سے روکتی ہے خواہ وہ قومی ہو یا فرقہ وارانہ۔ صاف بات ہے کہ حیدرآباد میں مسلمانوں کو سیاسی استیلاء حاصل ہے۔ وہاں مسلمانوں کے حقوق مفاد اور آزادی خطرہ میں نہیں۔ حکومت انجمن سے کہیں زیادہ طاقت ور واقع ہوئی ہے۔ حیدرآباد میں مسلم حکومت موجود ہے۔ اس صورت میں یقیناً وہاں مسلم لیگ کی ضرورت نہیں۔ اور اگر حیدرآباد میں مسلم لیگ قائم کی جائے گی تو وہ بجائے سیاسی انجمن کے خالص فرقہ وارانہ انجمن بن کر رہ جائے گی جو حکومت اور ہندوؤں کے درمیان تصادم کا باعث ہوگی۔

جواب نمبر ۶ : یہ غلط ہے کہ مسلم لیگ بے عمل جماعت ہے۔ مسلم لیگ ابتداء یعنی ۱۹۰۶ء میں اس غرض سے قائم ہوئی تھی کہ برطانیہ سے ہندوستان کو جو مراعات ملیں ان میں سے مسلمانوں کو پورا حصہ دلائے اور نیز مزید مراعات حاصل کرنے میں اکثریت کے ساتھ تعاون کرے چنانچہ اس نے یہ کیا کہ کانگرس نے ہندوستان کے لیے سیاسی اختیار حاصل کرنے کے لیے جب کوئی تحریک شروع کی تو مسلم لیگ نے اس کی تائید کی۔ مسلم لیگ اور کانگرس کے متحدہ مطالبہ پر گو چیمسفورڈ اصلاحات ہندوستان کو دی گئیں اور مسلم لیگ کے ذریعے مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو محسوس کر کے کانگرس ۱۹۱۶ء میں فرقہ وارانہ معاملات

میں مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہوئی جو ۱۹۲۵ء تک بلا تغیر جاری رہا۔ چونکہ مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد ابتداً محض ہندوستان کے اندرونی سیاسی امور تک محدود تھے اس لیے جب جنگ عظیم ہوئی اور خلافت اور اماکن مقدسہ کا مسئلہ سامنے آیا تو انہی مسلمانوں نے جو مسلم لیگ کے بانی اور رکن تھے خلافت کمیٹی قائم کی۔ خلافت کمیٹی نے جو کچھ کیا دنیا اس سے واقف ہے۔ عملاً اگر غور سے دیکھا جائے تو خلافت کمیٹی مسلم لیگ کا شعبہ امورِ خارجہ تھا۔ ۱۹۲۸ء سے جب نہرو رپورٹ کا فتنہ اٹھا نئے دستور موسومہ قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کے بننے تک مسلم لیگ نے ہندوستان کی سیاسی اختیار کی ترقی اور اس میں مسلمانوں کے حقوق کے تعین میں جو کچھ کیا اس قانون کے اندر موجود ہے البتہ یہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ نے کانگرس کے ساتھ مل کر سول نافرمانی کی تحریک نہیں چلائی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے بارے میں کانگرس نے مسلم لیگ کو اطمینان نہیں دلایا تھا بلکہ مسلمانوں کے علی الرغم سول نافرمانی شروع کر دی۔ کانگرس کی یہ سول نامتابعت کس مقصد کے لیے تھی۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ یہ کامل آزادی حاصل کرنے کے لیے کی گئی ہے مگر یہ غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب وائسرائے نے نہرو رپورٹ منظور کرنے سے انکار کر دیا جو مسلمانوں کے مفاد کے لیے سخت مضر تھی تو کانگرس نے اس ضد میں سول نامتابعت شروع کر دی مسلمان اس سول نامتابعت کو اپنے خلاف ہندوؤں کی طرف سے اس بات کا مظاہرہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں اصل طاقت ہندوؤں کی ہے اور مسلمان قابل اعتبار بھی نہیں ہیں تھا اور مسلمانوں کا یہ خیال صحیح تھا چنانچہ ثبوت میں پنڈت جواہر لعل نہرو کا یہ متکبرانہ قول پیش کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں صرف دو طاقتیں ہیں ایک کانگرس دوسری حکومت۔ یہ کہ مسلم لیگ جو کانگرس سے الیکشن لڑ رہی ہے اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ مخالفین کی

طرف سے ایک بے مغز الزام ہے اگر یہ عہد سے لے کر مجلس واضعان قانون کا ممبر منتخب کرنا مسلمانوں کے لیے مفید نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے حقوق و مفاد کا تحفظ کرے گا جن کے وہ مروجہ آئین کی رو سے مستحق ہیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمانوں کو مجلس وضع قانون میں بھیجنا ہی مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں۔ مسلم لیگ صرف اسی غرض کے لیے الیکشن میں جدوجہد کر رہی ہے کہ صرف ان لوگوں کو بھیجے جو ہندوستان کے سیاسی اختیار کی ترقی کے ساتھ مسلمانوں کے مذہبی تمدنی اور سیاسی حقوق کی پوری حفاظت کریں۔ اس کے برخلاف کانگریس ان مسلمانوں کو کونسل میں بھیجنا چاہتی ہے جو خاص مسلم حقوق کے تحفظ کے خلاف کانگریس کی اطاعت کریں۔ اگر یہ بات کہ مسلمان کسی عہد کے ساتھ مجالس واضعان قوانین میں جائیں اس قدر غیر اہم ہے کہ اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تو کانگریس اپنے قدیم دستور کے خلاف اس مرتبہ الیکشن لڑنے پر اس قدر کیوں مصر ہے کہ اس کو کمزور ہونا منظور اور کمزور ہو کر آزادیِ ہندوستان کی تحریک کو تعویق میں ڈالنا منظور مگر مسلم لیگ کے مقابلہ میں الیکشن لڑنا ضرور۔ واضح رہے کہ اس معاملہ میں کانگریس کا عمل جارحانہ ہے۔

جواب نمبر ۷ : مسلم لیگ نے اکتوبر ۱۹۳۷ء سے قبل ہندو اکثریت کے جارحانہ اقدامات کے مقابلہ میں مدافعت کر کے مسلمانوں کے دینی، مذہبی، سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی تنظیم کی حفاظت کی ہے۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء سے اس کا نیا دور شروع ہوا ہے اور اب وہ عام مسلمانوں کو مسلم لیگ کی تنظیم میں داخل کر کے مسلمانوں کے اجتماعی اور سیاسی خلفشار کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ رائے عامہ کی تربیت کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو آزادیِ کامل اور آزاد ہندوستان میں مسلم اور دوسری اقلیتوں کے لیے جمہوری تحفظ یعنی اکثریت کے فرقہ وارانہ جبر و استبداد کے امکان کے انسداد کے مقصد پر ہم خیال کرنا چاہتی ہیں۔ اسی غرض کے لیے ہر شہر

قصبے اور ضلع میں مسلم لیگ قائم کی جا رہی ہے۔ ہر عام مسلمان اس کا رکن بنایا جا رہا ہے نوجوانوں کی ایک بہت بڑی جمعیت بھرتی کی جا رہی ہے۔ اقتصادی خوشحالی کے لیے مسلمان دستکاروں کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کے رواج کی کوشش کی ہے۔ سود منسوخ کرانا مدنظر ہے اور مسلم لیگ کا جو ارادہ ہے وہ اس کے سالانہ اجلاسوں کی قراردادوں سے مفصل معلوم ہو گا۔

جواب نمبر ۸ : اگر کانگریس سے سمجھوتہ ہو گیا اور اکثریت کے جبر و استبداد کا کوئی خطرہ نہ رہا تو مسلم لیگ اس وقت بھی قائم رہے گی اور اشتراک عمل مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ہو گا مسلمان منتشر ہو کر کانگریس میں کبھی شریک نہ ہوں گے۔ مسلم لیگ کی یہ قطعی رائے ہے۔

جواب نمبر ۹ : اگر علماء مسلم لیگ کے ممبر بننا چاہیں تو ان کو الیکشن کے ذریعہ مسلم لیگ کی بااختیار کمیٹیوں میں آنے سے گریز کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ یہ تو بہترین صورت ہے لیکن خاص حالات میں بہت ہی مقتدر علماء کے لیے جو الیکشن کے ذریعہ نہ آسکیں۔ ایک صورت اور بھی ہے جس کو انگریزی میں کو آپشن کہتے ہیں یعنی وہ بطریق اضافہ آسکتے ہیں۔

جواب نمبر ۱۰ : مسلم لیگ میں دینی امور کے متعلق علماء کی رائے کو وہی وقعت حاصل ہو گی جو اب تک مسلمانوں میں ان کی رائے کو حاصل رہی ہے۔ ان معاملات میں اگر علماء کے درمیان کوئی اختلاف ہو تو اس کے لیے وہی طریقہ اختیار کیا جائے گا جو حدیث و قرآن کی رو سے صحیح ہو گا۔

جواب نمبر ۱۱ : یقیناً مسلم لیگ نے جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ کے تصادم کے ضرر کو محسوس کیا ہے اور اس کے انسداد کی اس کے ذہن میں یہ صورت ہے کہ جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ کے درمیان تقسیم عمل ہو جائے یعنی خالص دینی امور کا انصرام جمعیۃ اپنے ذمے لے لے اور مذہبی، تمدنی، سیاسی اور دوسرے شعبہ ہائے حیات کے انصرام میں شرکت

کے لیے حضرات علماء مسلم لیگ میں بحیثیت مسلمان شریک رہیں۔

جواب نمبر ۱۲: بے شک راجپوتوں اور غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام مسلم لیگ کے نزدیک ایک اہم فریضہ ہے اور سیاسی حیثیت سے بھی یہ بہت ضروری ہے مگر اس اہم اسلامی خدمت کے اہل صرف حضرات علماء ہیں۔ بدنصیبی سے مسلم لیگ کو ان کا پورا تعاون حاصل نہیں رہا ہے اس لیے وہ اس خدمت سے قاصر رہی ہے۔ اگر علماء اس کام کو شروع کریں تو مسلم لیگ ان کے ساتھ پورا تعاون کرے گی۔ (۱)

سہارن پور الیکشن

رمضان ۱۳۵۶ھ میں یوپی اسمبلی کے لیے سہارن پور کے ایک حلقے میں مسلم لیگ اور کانگرس میں مقابلہ ہوا۔ لیگ کے ٹکٹ پر مولانا منفعت علی اور کانگرس کی طرف سے چودھری ظفر احمد امیدوار تھے۔ چونکہ اس حلقے میں علماء کا بہت اثر و رسوخ تھا اس لیے الیکشن میں علماء نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ کانگرسی حلقے یہ پراپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھے کہ مسلم لیگ کے امیدوار کو ووٹ دینا ناجائز اور موجبِ عذاب ہے۔ اس سلسلے میں مولانا تھانوی کی طرف رجوع کیا گیا اور ان سے اس مسئلے کی شرعی حیثیت دریافت کی گئی سید ریاض الحسن نے مولانا تھانوی سے دریافت کیا کہ آیا مسلم لیگ کے امیدوار کو ووٹ دینا ناجائز اور موجب عذاب ہے۔ مولانا تھانوی نے ۵ رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ کو اس سوال کے جواب میں فرمایا کہ اس سوال کے دو جزو ہیں ایک عام یہ کہ مسلم لیگ اور کانگرس میں سے کس کو ووٹ دینا جائز ہے اور دوسرا ایک خاص صاحب کے متعلق۔ تو کانگرس

(۱) افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص ۵۳، ۲۴

کے حالات کا معلوم ہونا کافی ہے جو اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے کہ اے ایمان والو نہ ٹھہراؤ بھیدی اپنے غیر کو۔ تمھاری خرابی میں ان کی خوشی ہے۔ تم جس قدر تکلیف پاؤ ان کی بڑھتی ہے دشمنی ان کی زبان سے اور جو چھپا ہے ان کے جی میں سو اس سے زیادہ ہے۔" اس لیے موجودہ حالات میں حزم و یقین کے ساتھ میری یہ رائے ہے کہ جو شخص کانگرس کی موافقت میں میری کا مساعی ہو وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔ اور اس کی موافقت اور اس کے لیے مساعی کرنے کو میں اہل اسلام کے لیے مضر سمجھتا ہوں رہی مسلم لیگ، تو اس میں کوئی وجہ مضرت و عدم جواز معلوم نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص دیندار، تجربہ کار، مسلمانوں کا خیر خواہ مسلم لیگ کی طرف سے امیدوار ہو تو بلاشبہ اس کو ووٹ دینا جائز بلکہ افضل ہے۔"(۱)

مولانا منفعت علی کا خط اور مولانا تھانوی کا جواب

۵ فروری ۱۹۳۶ء کو مولوی منفعت علی نے جو کہ یوپی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو چکے تھے مولانا تھانوی کو ایک طویل خط لکھا جس میں آپ نے کانگرس اور مسلم لیگ کے بارے میں آپ کے خیالات اور رائے دریافت کی۔ مولوی صاحب نے اپنے خط میں لکھا "حضرت سیدی و مولائی دام مجدکم السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ آج کل ہندوستان میں دو سیاسی جماعتیں ہیں ایک کانگرس اور دوسری مسلم لیگ:۔ کانگرس کا دعویٰ ہے کہ وہ ملک کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور ہر شخص کو بلاتفریق و تمیز مذہب و ملت اس جماعت کا

۱۔ "افاضاتِ اشرفیہ در مسائلِ سیاسیہ" ۶۵، ۶۶ نیز دیکھو روزنامہ انقلاب (لاہور) ۱۰ ستمبر ۱۹۳۷ء

ممبر ہونا چاہیئے اور اس جماعت کے ہوتے ہوئے کسی دوسری جماعت میں شریک نہیں
ہونا چاہیئے۔ مسلم لیگ خالص مسلمانوں کی جماعت ہے اور اس کا نصب العین بھی ملک
کو آزاد کرانا ہے مگر اس کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے کچھ حقوق ایسے ہیں جن کے تحفظ کے
لیے اِس جماعت کا علیحدہ نظام و قیام ضروری ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دونوں سیاسی جماعتیں
سیاسی ترقی میں ایک دوسرے کی شرکت میں کام کر سکتی ہیں مگر کانگرس میں مدغم ہو کر وہ
خالص حقوق محفوظ نہیں رہ سکتے۔ کانگرس کا مسلمانوں کے ساتھ شروع سے کیا رویہ رہا ہے
اس کے متعلق تو مفصل بحث کتاب موسومہ آزادی کی جنگ
مؤلفہ عبدالوحید خاں صاحب میں درج ہے جو غالباً حضرت والا
کی نظر سے بھی گزری ہے۔ بعد کے بھی کچھ واقعات یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ کانگرس کی
اصل غرض یہ ہے کہ ہندوستان کا محافظ انگریز ہے اور زیر سایہ برطانیہ حکومت ہندوؤں
کے ہاتھ آجائے۔

کانگرس اس وقت ہندی زبان اور لباس کے رواج دینے میں بے حد کوشاں ہے
ملک میں اس وقت آئینی جنگ ہے جس میں جملہ معاملات کثرت رائے سے طے ہوتے
ہیں۔ اس وقت کانگرس کی مرکزی جماعت اور مجلسِ عاملہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے
ان کانگرسی مسلمانوں کی کیفیت یہ ہے کہ مسلمانوں کے خاص حقوق کے تحفظ کو فرقہ پرستی سمجھتے
ہیں اور مسلمانوں کے احتجاج پر یہ حجت پیش کرتے ہیں کہ اگر مسلمان کثرت کے ساتھ کانگرس
میں شریک ہو جائیں تو ہندوؤں کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ دوسری چیز
جو وہ پیش کرتے ہیں وہ مخلوط انتخاب ہے۔ ان کی حجت یہ ہے کہ جب تک جداگانہ انتخاب
ہے ایک مذہب والا دوسرے مذہب سے بے نیاز ہے جس میں اتحاد کی امید نہیں۔

اگر انتخاب مخلوط ہو جائے تو ہندو مسلمان ایک دوسرے کے جذبات کے احترام پر مجبور ہونگے
لیکن اس کی تردید میں چند واقعات ہیں۔ ہندو مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ایسا ہے
کہ مسلمان تو مجبور ہو سکتا ہے مگر ہندو کو ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ دو چار جگہ ڈسٹرکٹ بورڈ
اور میونسپلٹی کے انتخابات مخلوط ہوتے اور مسلمان ان نشستوں سے بھی محروم ہوئے جن پر وہ
پہلے سے منتخب چلے آتے تھے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہندوؤں کی اکثریت ہے اور مخلوط
انتخاب میں مسلمانوں کا صحیح نمائندہ کبھی منتخب نہیں ہو سکتا۔ اور اکثریت کی بناء پر ایسے
قانون بھی پاس ہو سکتے ہیں جو مسلمانوں کے حقوق کے منافی ہوں۔

مسلم لیگ کی قیادت اس وقت مسٹر محمد علی جناح کے ہاتھ میں ہے۔ گو مسٹر محمد علی
جناح آبائی شیعہ ہیں مگر غیر متعصب ہیں اور گو کوئی متقی شخص نہیں لیکن سیاست میں ماہر سمجھے
جاتے ہیں۔ اس کے کانگرس والے بھی معترف ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ سرکاری
آدمی نہیں ہیں بلکہ قوم کی آزادی کے لیے ان کے دل میں درد موجود ہے۔ اس لیے گورنمنٹ
کے مقابلہ میں اور کانگرس میں بھی انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کے لیے آواز بلند کی۔ مسٹر محمد علی
جناح کے خلاف یہ بھی غلط پراپیگنڈہ ہے کہ وہ جاہ پسندی کے لیے یہ سب کام کر رہے ہیں
اگر وہ جاہ پسند ہوتے تو کبھی کسی خطاب یا عہدہ کی اپنے لیے کوشش کرتے جس کا ملنا بہت
آسان تھا مگر انہوں نے کبھی بھی اس کی خواہش نہیں کی۔ بہرحال کلمہ گو ہیں۔

اہم سوال اس وقت علماء کی رائے کا ہے۔ بعض حضرات کانگرس میں شرکت کو
ترجیح دیتے ہیں۔ دوسرے حضرات مسلم لیگ میں شامل ہونے پر زور دیتے ہیں۔ حضرات
علماء کے اس اختلاف سے عوام کو رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ اس لیے یہ امر دریافت طلب
ہے کہ حضرت اقدس کے نزدیک دونوں مذکورہ بالا جماعتوں میں سے مسلمانوں کو کونسی جماعت

میں شریک ہونا چاہیئے" (۱)

اس خط کے جواب میں مولانا تھانوی نے تحریر فرمایا کہ دونوں جماعتوں میں شرکت کے بارہ میں مختلف اوقات میں مختلف جگہوں سے سوالات پوچھے جاتے تھے مگر چونکہ مسلم لیگ کے متعلق زیادہ معلومات حاصل نہیں تھیں اس لیے مسلم لیگ کو سوالات بھیجے گئے ہیں تاکہ حالات کا صحیح اندازہ ہو سکے"۔ مسلم لیگ کے بارے میں آپ نے فرمایا" اس میں تو کوئی شک نہیں کہ فضا حاضرہ میں مسلمانوں کو شدید استحکام کے ساتھ منظم ہونے کی ضرورت ہے اور ان کے تمام منافع و مصالح کی حفاظت اور تمام مفاسد و مضار سے صیانت اسی تنظیم پر موقوف ہے"۔ مولانا کی رائے میں اس وقت کوئی بھی سیاسی جماعت ایسی نہیں تھی جس کو صحیح معنوں میں اسلامی کہا جا سکے۔ اس لیے ان حالات میں مسلمان اس جماعت میں شریک ہو سکتے تھے جس کی کم از کم اصلاح کی گنجائش تو موجود ہو۔ مسلم لیگ بھی اسی زمرے میں آتی تھی۔ اس لیے مسلم لیگ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے آپ نے لکھا" حالات کی تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کے نقائص رفع سہل ہے اور کانگرس کی اصلاح ناممکن ہے۔ پس اس اصل کی بنا پر شرح صدر کے ساتھ میری یہ رائے قائم ہوئی ہے کہ مسلمانوں کو توکل اور اطمینان کے ساتھ مسلم لیگ میں داخل ہونا چاہیئے اور بعد میں حتی الوسع اس کی اصلاح میں لگ جانا چاہیئے۔"(۲)

ایک صاحب نے مولانا تھانوی سے مندرجہ بالا مضمون کے متعلق فرمایا کہ آپ کا یہ مضمون بہت ہی گٹھا ہوا اور سب پہلوؤں کا جامع تھا۔ اس پر مولانا نے فرمایا" میں عربی

۱۔ امداد الفتاوی جلد چہارم ص ۵۸۰ - ۵۸۷

۲۔ "الافاضات الیومیہ" جلد ہفتم ص ۲۴۴

تو نہیں کرتا کیونکہ یہ میرا منہ کہاں لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ وہ تو وہبی عبارت ہے کیونکہ رات کے دو بجے دفعتہً بلا کسی داعیہ کے خود قلب میں تقاضا پیدا ہوا کہ اس وقت بیٹھ کر لکھ۔ اور میں اسی وقت بیٹھ کر بلا ساختہ جو عبارت ذہن میں اترتی گئی بلا تامل قلم برداشتہ لکھتا چلا گیا۔ (۱)

مولانا تھانوی نے بعد میں بے شمار موقعوں پر اس بات کی وضاحت کی کہ مسلم لیگ کی حمایت میں نے اس بنا پر کی چونکہ اس جماعت میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اس لیے کانگرس کی نسبت اس جماعت کی اصلاح ممکن اور آسان ہے۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء کو لکھنؤ میں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا" میں نے جو اعلان کیا ہے اس میں مسلم لیگ کی حمایت کی ہے مگر صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں جماعتیں قابل اصلاح بلکہ الاصلاح ہیں۔ ہاں مسلم لیگ نسبتاً کانگرس سے اچھی اور بہت اچھی ہے۔ لہٰذا اس میں اصلاح اور درستی کی نیت سے شریک ہونا چاہیئے۔ میں کانگرس کو اندھے کے مشابہ سمجھتا ہوں اور مسلم لیگ کو کانے کے مشابہ اور ظاہر ہے کہ اندھے پر کانے کو ترجیح ہوگی۔ مثلاً کسی کو نوکر رکھنے کی ضرورت ہو اور اتفاقاً دو نوکر ملیں ایک اندھا ایک کانا تو وہ کس کو نوکر رکھے گا یقیناً کانے کو۔ بس اسی بنا پر میں مسلم لیگ کا حامی ہوں۔ (۲)

مولانا تھانوی مسلم لیگ کی حمایت کے اعلان کے بعد اس کی ہر ممکن اصلاح میں مصروف ہو گئے۔ ایک مجلس میں دوران گفتگو فرمایا خود بھی اس کی (مسلم لیگ) کی اصلاح کا برابر سلسلہ رکھتا ہوں۔ چنانچہ عام رسائل بھی اور خاص ذمہ داروں کے نام خطوط بھی جاتے رہتے ہیں

۱۔ امداد الفتاوی، جلد چہارم، ص ۵۸۷

۲۔ "اسعد الابرار" ص ۱۲۰، ۱۲۱

ابھی لیگ کے سالانہ اجلاس پٹنہ میں اپنے عزیزوں اور دوستوں کا وفد روانہ کیا۔ غرض مجھ سے جتنا ہو سکتا ہے لیگ کے ذمہ دار حضرات کو دین کی برابر تبلیغ کر رہا ہوں۔" (۱)

اب مولانا تھانوی مسلم لیگ کی ترقی اور اصلاح کے کس قدر خواہاں تھے اس کا اندازہ مولانا کے اس بیان سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے کانپور میں مسلمانوں کے دو گروہوں میں خون ریز فساد کے سلسلے میں جاری کیا۔ مولانا کا یہ بیان روزنامہ "عصرِ جدید" کلکتہ میں شائع ہوا۔ مولانا نے اس بیان میں اس حادثہ پر گہرے رنج اور دُکھ کا اظہار کیا۔

مولانا نے مسلم لیگ کو تمام مسلمانوں کی نمائندہ جماعت قرار دیتے ہوئے اس حقیقت کا اظہار کیا کہ مسلم لیگ کا مقصد مسلمانوں کی تنظیم اتحاد و اتفاق اور ان کے حقوق کی نگہداشت کرنا ہے۔ مولانا نے مسلم لیگ کے دشمنوں کو "ہمارے دشمن" کے نام سے یاد کرتے ہوئے فرمایا کہ "وہ مسلم لیگ کی سرسبزی اور کامیابی کو کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتے۔" اس موقع پر شاید کانپور مسلم لیگ کے چند ارکان نے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ مولانا نے ان حضرات کے طرزِ عمل پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا کہ ایسے حضرات کو لیگ چھوڑنے کی بجائے چاہیے تھا کہ مسلم لیگ سے اپنی شکایات رفع کرنے کا مطالبہ کرتے اور ان کے نزدیک اس میں جو کمزوری ہو اس کی اصلاح کی کوشش کرتے۔ مولانا نے مسلم لیگ کو ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے منظم جماعت قرار دیتے ہوئے مسلمانوں سے اسے حتی الامکان اور مزید مضبوط اور طاقتور بنانے کی اپیل کی تاکہ مسلمانوں کے حقوق ان کے جان و مال اور مذہب اغیار کی دست برد سے محفوظ رہیں۔ مولانا نے تمام مسلمانوں کو "مخلصانہ اور خیر خواہانہ" مشورہ دیا کہ وہ جماعت مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں کیونکہ اللہ اور اس کے رسول کا یہی حکم ہے کہ مسلمان ایک ہی جماعت میں شامل رہیں۔" (۱)

(۱) روزنامہ عصرِ جدید (کلکتہ) ۲۰ ستمبر ۱۹۳۸ء/۶

اب مولانا نے کھل کر مسلم لیگ کی حمایت کرنا شروع کی۔ مولانا کا مسلمانوں کو مشورہ تھا کہ وہ کانگریس سے علیحدگی اختیار کریں اور مسلم لیگ میں شامل ہو کر اس کی اصلاح کریں۔ مولانا نے تھانہ بھون میں مسلم لیگ کی شاخ کھولنے کی اجازت دے کر مسلم لیگ میں اپنی گہری دلچسپی کا واضح ثبوت فراہم کیا۔ (۱)

جھانسی الیکشن

کانگریس اور مسلم لیگ کا پہلا مقابلہ ۱۹۳۷ء میں جھانسی کے مقام پر ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان باقاعدہ مقابلہ کی صورت پیدا ہوئی تھی۔ جوں جوں الیکشن کے دن نزدیک آ رہے تھے جھانسی کے مسلمان مسلم لیگ کے بارے میں مولانا تھانوی کی رائے جاننے کے لیے بہت مضطرب تھے۔ الیکشن کی تاریخ نزدیک آنے پر جھانسی کے مسلمانوں نے مولانا تھانوی سے بذریعہ تار یہ دریافت کیا کہ آیا مسلم لیگ کو ووٹ دینا جائز ہے۔ اس مرحلہ پر مولانا تھانوی نے مولانا شبیر علی اور مولانا ظفر احمد عثمانی کو مشورہ کے لیے طلب فرمایا۔ مولانا تھانوی نے ان دونوں اصحاب کو کہا کہ مسلم لیگ بڑے لوگوں اور زمینداروں کی جماعت ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اگر یہ جماعت غالب آ گئی تو یہ اسلامی نظام رائج کریں گے یا نہیں۔ اگرچہ میں مسلم لیگ کو کانگریس سے بہتر جماعت سمجھتا ہوں لیکن پھر بھی میرے دل میں شبہ ہے" اس پر مولانا ظفر احمد عثمانی نے فرمایا کہ آپ اس نوع کا تار دیدیں کہ "کانگریس کو ووٹ نہ دو" مولانا تھانوی کو یہ مشورہ پسند آیا اور آپ نے اسی مضمون کا تار جھانسی بھجوا دیا۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مسلم لیگ کو کامیابی ہوئی اور کانگریس

(۱) ہفتہ وار انقلاب (لاہور) ۵ اپریل ۱۹۳۸ء ص ۱۱

کو اس معرکہ میں شکست اٹھانی پڑی۔ مولانا ظفر علی خان نے اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ (۱)

لیگ کو دی خدا نے فتح مبیں
کانگرس کو شکستِ فاش ہوئی

مولانا شوکت علی اور مولانا مظہر الدین یہ خوشخبری سنانے مولانا کے پاس تھانہ بھون حاضر ہوئے اور آپ سے فرمایا "گو ہمارے پاس نہ لاریاں تھیں نہ ہی دوسرا ساز و سامان لیکن آپ کے تار نے الیکشن کا پانسہ پلٹ دیا۔ ان دونوں حضرات نے کامیابی کی خوشی میں تھانہ بھون میں جلسہ کرنے کی اجازت چاہی۔ مولانا نے نہ صرف جلسہ کی اجازت دی بلکہ مولانا ظفر احمد عثمانی کو فرمایا کہ آپ میری طرف سے تقریر کریں۔ (۲)

یہ جلسہ یکم اپریل ۱۹۳۸ء کو منعقد ہوا اور اس میں تقریباً دس ہزار مسلمانوں نے شرکت کی۔ مولانا ظفر احمد نے مولانا تھانوی کا بیان پڑھ کر سنایا۔ اس بیان میں مولانا تھانوی نے جلسے میں خود نہ شامل ہونے پر معذرت چاہی لیکن ساتھ ہی یہ کہہ کر اس بات کی تلافی کر دی کہ "میں دل سے آپ کے ساتھ ہوں اور مسلم لیگ کے مقاصد حسنہ سے متفق اور اس کی ترقی و بہبود کے لیے دعاگو ہوں"۔ مولانا نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی ہمت کے موافق مسلم لیگ کی ترقی اور شرعی حیثیت سے اس میں جو خامیاں ہیں اس کی اصلاح کے لیے بھرپور کوشش کریں۔ ساتھ ہی مولانا نے مسلمانوں کو یہ بھی مشورہ دیا کہ انہیں اس عقیدے پر پختہ ایمان رکھنا چاہیئے کہ مسلمانوں کی ترقی کا راز صرف اور صرف شریعت کی

۱۔ ظفر علی خاں چمنستان (مکتبہ کاروان لاہور) ۱۹۶۷/ ص ۸۱

۲۔ مکتوب گرامی/ مولانا ظفر احمد تھانوی بنام راقم ۱۲ ربیع الاول ۱۳۸۷ھ

اتباع میں مضمر ہے اور اتباعِ شریعت کے بغیر مسلمانوں کی حقیقی فلاح و بہبود ناممکن ہے مولانا نے مذہب اور سیاست میں تفریق کے یورپی نظریہ پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے اس نظریہ کو "سراسر باطل" اور "یورپ کی دھریت" کا ثمرہ قرار دیا۔ مولانا کا کہنا تھا کہ اس وقت جن اقوام نے ترقی کی ہے۔ دراصل انہوں نے اسلامی تعلیمات پر عمل کر کے ہی اس منزل کو حاصل کیا ہے۔ مولانا نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ دوسری اقوام نے تو مسلمانوں کے شعائر اختیار کر کے ہر میدان میں اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے اور مسلمانوں نے ان شعار کو ترک کر کے اپنی بربادی کا سامان خود ہی پیدا کر لیا۔ مولانا نے دریافت کیا کہ "آیا تنظیم و دیانت"، "امانت"، "اتحاد و ایثار"، "عدل"، "وفائے عہد"، "سادگی"، "کفایت شعاری"، "انتظام"، "جفاکشی"، "محنت اور خدمت"، "قوم اور قومی نشان کی حفاظت ان تمام چیزوں کا نام اسلام اور مسلمانوں سے پہلے کسی نے سنا تھا۔ یہ صرف مسلمانوں کے گھر کی دولت تھی جس سے وہ آج کوسوں دور ہیں اور دوسری قومیں ان اصولوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئی ہیں"۔ مولانا نے مسلمانوں کی اس روش پر سخت افسوس کا اظہار کیا کہ وہ اپنے قومی اور مذہبی نشانات کو فراموش کرتے جا رہے ہیں اور دوسری قوموں کی تقلید اور ان کی جیسی وضع قطع اختیار کرنے میں ذرہ برابر بھی جھجک اور شرم محسوس نہیں کرتے۔ مولانا کے نزدیک اتحادِ ظاہری کا باطنی اتحاد پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس لیے جو قوم ظاہر میں یگانگت نہیں رکھتی وہ باطن میں بھی متحد نہیں ہو سکتی۔ مولانا نے مسلم لیگ کے عہدہ داران اور ذمہ داران کو ان پر زور دیا کہ وہ اسلامی تعلیمات پر عمل کریں تاکہ عوام کی اصلاح کا کام آسان ہو سکے۔ مولانا نے ان کانگرسی مسلمانوں کے طرز عمل پر بھی کڑی نکتہ چینی کی جو ہندوؤں کی تقلید میں اپنے مذہبی اصولوں تک کو قربان کرنے کو تیار تھے۔ مولانا نے انہیں یاد دلایا کہ وہ ہندوؤں

کی تو ہر بات میں تقلید کرنے کو تیار رہتے ہیں مگر اس معاملے میں اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ ہندو اپنی "قومی وضع" اور "قومی نشان" کے کس درجہ پابند ہوتے ہیں۔ وہ اپنے "خانگی مذہب" کے معمولی شعار کو بھی کسی کی خاطر نہیں چھوڑتے اور مسلمان اپنے آسمانی مذہب" کے بڑے سے بڑے شعار کو محض ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے چھوڑنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

مولانا نے مسلمانوں کو یہ اصول ذہن نشین کرایا کہ جنگ خواہ آئینی ہو یا غیر آئینی مسلمانوں کو خدا کے علاوہ کسی اور امداد کی ضرورت نہیں اور امداد الٰہی کی شرط احکام الٰہی کی پابندی ہے۔ مولانا نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ خدا کے فرماں بردار بندے بن جائیں وہ خدا کے فرمانبردار بندے بن جائیں۔ اسی صورت میں تائید غیبی ان کا ساتھ دے گی۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے ماضی کی طرف لوٹیں اور ہر شخص ہر حکم الٰہی کی پابندی کو اپنے ذمہ لازم سمجھ لے۔ (۱)

تبلیغی وفود برائے آل انڈیا مسلم لیگ

مولانا تھانوی کی آل انڈیا مسلم لیگ میں دلچسپی کا اندازہ اس امر سے لگانا چاہیئے کہ آپ نے نہ صرف مسلمانوں کی اس واحد نمائندہ جماعت کے حق میں فتاویٰ جاری کیے بلکہ مسلم لیگ کی اصلاح کی غرض سے اپنے کئی وفود اس کے اجلاسوں میں روانہ کئے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا وفد ۴، جون ۱۹۳۸ء کو ترتیب دیا گیا۔ ۴، جون ۱۹۳۸ء کو بمبئی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہونا طے پایا تھا۔ مولانا تھانوی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانی کی زیر قیادت ایک وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس وفد کے دوسرے ارکان

۱۔ روزنامہ "عصر جدید" (کلکتہ) ۱۱ اپریل ۱۹۳۸ء / ۲:۱

میں مولانا شبیر علی تھانوی اور مولانا عبدالکریم گمتھلوی شامل تھے۔ مولانا تھانوی نے مندرجہ ذیل خط کے ذریعے نواب اسمٰعیل خان کو وفد کی روانگی سے مطلع کیا۔

"مکرم و محترم نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب صدر یو پی مسلم لیگ السلام علیکم ورحمۃ اللہ گرامی نامہ بدست وصل بلگرامی موصول ہوا۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ الحمدللہ آپ نے بھی شرکت علماء کی اہمیت کو محسوس کیا۔ حسب مشورہ ایک خط آج مولانا شوکت علی کی خدمت میں اس وفد کے قیام وغیرہ کے انتظام کی بابت لکھ دیا گیا ہے اور یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ یہ حضرات کھانے کا انتظام خود کریں گے۔ قصہ یہ ہے کہ یہ وفد انشاء اللہ یکم جون کو یہاں سے روانہ ہو کر تین جون کو صبح کی ایکسپریس سے بمبئی پہنچیں گے۔ امید ہے کہ جناب والا اس وفد کی شرکت کے لیے مسٹر محمد علی جناح اور دیگر اراکین مسلم لیگ سے اس درمیان تمام معاملات ضرور طے فرمائیں گے۔" (۱)

اس موقعہ پر مولانا تھانوی نے مولانا شبیر علی تھانوی کو چند ہدایات بھی دیں۔ مولانا نے فرمایا کہ "جناح صاحب سے جو باتیں کرنی ہیں وہ میں نے لکھ کر مولانا شبیر احمد عثمانی کو دے دی ہیں وہ امیر الوفد بھی ہیں اور گفتگو کا سلیقہ بھی ان کو بہتر آتا ہے۔ لیکن اگر تم کو بھی کسی سے گفتگو کا موقع مل جائے تو گفتگو میں اس بات کا لحاظ رکھنا کہ گفتگو نرم ہو۔ اختلافی مسائل درمیان میں نہ آئیں۔ اگر مخالف اختلافی مسائل درمیان میں لانا چاہے تو بہ لطائف الحیل اس سے گریز کرنا اور دوسری گفتگو شروع کر دینا اگر مخالف کے کسی عمل کے متعلق تنقید کرنا ہو تو وہ تنقیدی نہ ہو بلکہ ہمدردانہ اور تبلیغی ہو، الفاظ بھی نرم ہوں۔ جواب ایسا دینا چاہیئے کہ مخاطب سمجھ سکے جس کی میں ایک مثال دیتا ہوں کہ ایک مرتبہ میں فتح پور سے ہسوہ آرہا تھا۔

۱۔ منشی عبدالرحمٰن۔ تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی (شیخ اکیڈمی لاہور ۱۹۷۵ء) / ۶۶-۶۷

ریل میں علی گڑھ کے کچھ نوجوان سوار ہوئے۔ مجھے وہ پہچانتے نہ تھے مگر شکل سے مولوی سمجھ کر کہنے لگے کہ مولوی صاحب شریعت میں کتا پالنا کیوں منع ہے۔ حالانکہ اس میں بہت سی صفات موجود ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ علی گڑھ میں قومی ہمدردی کا بہت زور تھا۔ اب اگر میں ان کے سامنے شرعی مسائل بیان کرتا اور اللہ اور اس کے رسول کے احکامات بیان کرتا تو بحث کا دروازہ کھل جاتا اور وہ مقصد کہ ان کے دل میں کتا پالنے کی برائی بیٹھ جائے حاصل نہ ہوتا۔ اس لیے میں نے ان سے کہا کہ کتے پالنے کی ساری صفات مسلم مگر ایک عیب ایسا ہے کہ ساری صفات پر پانی پھیر دیتا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ مولانا وہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس میں قومی ہمدردی نہیں ہے۔ اپنی قوم کے کسی فرد کو دیکھتا ہے تو فوراً لڑنے لگتا ہے۔ اس پر بہت خوش ہوئے تو اس کا لحاظ رہے کہ مقصد ہاتھ سے نہ جانے پائے لیکن مخاطب کے فہم کا بھی ضرور خیال رکھا جائے۔[1] اتفاق سے مولانا شبیر احمد عثمانی کی والدہ سخت بیمار پڑ گئیں اور یوں اس وفد کی روانگی کا معاملہ مشکوک ہو گیا چنانچہ مولانا تھانوی نے مندرجہ ذیل خط میں نواب اسمٰعیل خان کو لکھا کہ "جناب کو اس سے قبل اطلاع دی گئی تھی کہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ میں ۴؍جون کو علماء کا وفد شامل ہوگا اور جناب نے اس کے لیے مسرت کا اظہار فرمایا تھا اور جملہ ذمہ داری قبول فرمائی تھی مگر اتفاق سے مولانا شبیر احمد عثمانی کی والدہ کی علالت نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے۔ اس لیے مولانا موصوف کی روانگی بھی مشکوک ہو گئی ہے جس کی اطلاع جناب کو دینی ضروری ہے۔ وقت پر تار دے دیا جائے گا کہ وفد روانہ ہوا یا نہیں۔ چونکہ وفد کی روانگی قطعی طور پر ملتوی نہیں کی گئی۔ اس لیے احتیاطاً آپ جملہ انتظامات درست فرمانے میں دریغ نہ کریں۔

۱۔ تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی / ص ۶۹

بہرحال یہ وفد مجلس عاملہ کے اجلاس میں شریک نہ ہو سکا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس پٹنہ اور مولانا تھانوی کا تاریخی بیان

آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۲۶، ۲۷؍دسمبر ۱۹۳۸ء کو پٹنہ میں منعقد ہوا۔ چونکہ اس سے قبل بھی ایک بار علما کا وفد بھیجنا تجویز ہوا تھا مگر اسے عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا اس لیے اس مرتبہ مولانا تھانوی نے مولانا مرتضیٰ حسن کی زیر قیادت ایک وفد ترتیب دے کر آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ میں شرکت کے لیے روانہ کیا۔ وفد کے دیگر ارکان میں مولانا شبیر علی تھانوی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا عبدالجبار، مولانا عبدالغنی مولانا معظم حسین شامل تھے۔ اس وفد نے پٹنہ سیشن میں شرکت کی اور قائد اعظم کو مولانا تھانوی کا پیغام پہنچایا۔ مولانا شبیر علی تھانوی نے اس سلسلے میں لکھا کہ "جب ہم پٹنہ پہنچے تو ہمارے بعض ساتھیوں نے جلسہ میں شریک ہونا چاہا مگر میں نے کہا کہ ہم اس وقت آزاد نہیں بلکہ حضرت کے فرستادہ ہیں۔ جب تک جناح صاحب سے گفتگو نہ ہو اور ہم دیکھ نہ لیں کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں ہم جلسہ میں شرکت نہیں کر سکتے۔ میں ابھی نواب زادہ لیاقت علی صاحب کے پاس جاتا ہوں اور ان کی معرفت مسٹر جناح سے وقت گفتگو مقرر کرتا ہوں۔ لہٰذا میں نے واپس آکر جناح صاحب سے وقت لیا اور اسی روز پانچ بجے ملاقات کی۔ ہم سب جناح صاحب کے پاس ٹھیک پانچ بجے پہنچے۔ اوپر پہنچے جناح صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے ہم کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ سب سے مصافحہ فرمایا۔ ایک گھنٹہ کی گفتگو میں بہت سے مسائل زیر بحث آئے۔ تبلیغ سے فارغ

ہو کر اگلے روز وفد نے مولانا تھانوی کے نمائندوں کی حیثیت سے مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کی۔ اس اجلاس میں مولانا تھانوی کا تاریخی بیان پڑھ کر سنایا گیا (۱)۔

مولانا ظفر احمد عثمانی جو اس وفد کے ممبر اور جنہوں نے اس تاریخی اجلاس میں مولانا تھانوی کا پیغام پڑھ کر سنایا تھا۔ اس واقعہ کے متعلق راقم کو تحریر فرمایا "اس وفد نے اجلاس سے ایک دن پہلے عصر کے بعد قائدِ اعظم سے ملاقات کی اور ان سے فہمائش کی تھی کہ مسلمان مذہبی قوم ہیں جب تک سیاست کے ساتھ مذہب کو شامل نہیں کیا جائے گا کامیابی نہیں ہوگی۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جب تک نرے سیاسی رہے۔ قوم پر اثر نہ ہوا اور جب مذہبی رنگ میں رنگے گئے قوم پر اثر ہوا۔ آپ بھی مسلم لیگ میں مذہب کو شامل کر لیں تو کہنے لگے کہ میرا خیال ہے کہ سیاست کو مذہب سے علیحدہ رکھا جائے۔ ہم نے کہا یہ تو یورپ کی سیاست ہے۔ اسلامی سیاست یہ ہے کہ خلیفہ اسلام اور قائد حرب نماز کا بھی امام تھا۔ اور جنگ میں بھی قائد ہوتا تھا۔ جب تک مسلمان اچھے رہے یہی صورت رہی جب سے اہل سیاست نے مذہب کو چھوڑا تنزل ہو گیا۔ مصطفےٰ کمال نے مذہب کو چھوڑا تو ترکی سلطنت مختصر رہ گئی۔ جب تک مذہبی شان تھی خلیفہ اسلام کی بڑی سلطنت تھی اور بڑا رعب تھا۔ امان اللہ خان نے مذہب کو چھوڑا قوم نے علیحدہ کر دیا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ علامہ اقبال نے سفر افغانستان سے واپسی پر یہی بات ارشاد فرمائی کہ "امان اللہ نے جب مذہب کو چھوڑا تو تخت بھی ہاتھ سے گیا۔ اس گفتگو کا قائد اعظم پر اثر ہوا اور اگلے روز انہوں نے کھلے اجلاس میں اپنی تقریر میں کہا کہ اسلام عقائد، عبادات، معاملات اور سیاسیات کا

۱۔ "تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی" ۴۳/

مجموعہ ہے۔ اس تقریر کو مولانا مظہر الدین مدیر الامان نے اپنے اخبار میں اس نوع کی سرخی کے ساتھ شائع کیا تھا۔ مولانا حکیم الامت تھانوی کی روحانیت کی تاثیر اور قائد اعظم کی تقریر۔ قائد اعظم سے ہم نے یہ بھی کہا کہ ہم یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ اہل سیاست بڑے متقی اور پرہیزگار بن جائیں مگر یہ درخواست ضرور کریں گے کہ مسلم لیگ کے ذمہ دار ارکان نمازی ضرور بن جائیں اور کل نماز جماعت کے ساتھ ادا کریں۔ قائد اعظم نے کہا کہ اس پر جھگڑا ہوگا کہ امام دیوبندی ہو یا سنی یا شیعہ۔ ہم نے کہا آپ صرف یہ اعلان کر دیں کہ ہم نماز باجماعت پڑھیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا مسلم لیگ کا اجلاس دو بجے یہ اعلان کر کے ملتوی ہو گیا کہ نماز ظہر کے لیے اجلاس ملتوی ہوتا ہے۔ چنانچہ قاضی شہید امام بنے قائد اعظم نے تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کی (۱)۔

اگلے روز وفد نے مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کی جہاں مولانا ظفر احمد عثمانی نے مولانا تھانوی کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ جمیل الدین احمد صاحب جو کہ تحریک پاکستان کے سرکردہ کارکن، قائد اعظم اور تحریکِ پاکستان کے متعلق کتابوں کے مصنف اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ممبر رہ چکے ہیں اور جنہیں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ کے تمام سالانہ اجلاسوں اور اکثر بڑے جلسوں میں شرکت کا اعزاز حاصل ہے۔ مولانا تھانوی کے اس پیغام کے بارے میں تصدیق کرتے ہوئے راقم کو لکھا کہ "جہاں تک مجھے یاد ہے پٹنہ کے مسلم لیگ کے اجلاس میں مولانا اشرف علی تھانوی کا ایک تحریری بیان بتائید مسلم لیگ تقسیم ہوا تھا۔ مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ وہ پڑھ کر سنایا گیا تھا یا نہیں" (۲)

۱۔ مکتوب ظفر احمد عثمانی بنام راقم مورخہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۸۰ھ

۲۔ مکتوب جمیل الدین احمد بنام راقم ۵ دسمبر ۱۹۶۸ء

مولانا تھانوی کا تاریخی بیان

مولانا تھانوی کا یہ تاریخی بیان پٹنہ اجلاس میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا۔

احقر باوجود اپنی ہر نوع کی نا اہلیت کے محض محبت و خیر خواہی سے سب مسلمانوں کی خدمت میں عموماً اور حضرات اہل لیگ کی خدمت میں خصوصاً عرض کرتا ہے کہ اس وقت بوجہ خاص انقلاب کے جس چیز کی مسلمانوں کو سخت ضرورت ہے وہ اجتماع اور تنظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ سے حضرات اہل لیگ کے لیے دعا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس کا احساس کر کے اس کا انتظام دل و جان سے شروع کیا اور میں نے اس کے قبل بھی اس کا استحسان و اہمیت ظاہر کرنے کے لیے تنظیم المسلمین کے نام سے ایک مضمون شائع کیا ہے اور اس پر جہاں تک معلوم ہوا ہے۔ بفضلہ تعالیٰ ثمرہ مطلوبہ بھی ایک کافی درجہ میں مرتب ہوا لیکن جس پیمانہ پر جی چاہتا تھا ابھی اس کا انتظار ہے۔

حضرات اس وقت مسلمانان ہندوستان جس دور سے گزر رہے ہیں اور جن مشکلات کا ان کو سامنا ہو رہا ہے باخبر طبقہ اس سے بخوبی واقف ہے اور خدا کا شکر ہے کہ عام مسلمانوں کے احساسات اس وقت بیدار ہو چکے ہیں۔ ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی فہم و فراست کے موافق مدبران لیگ نے کچھ اسباب بھی اختیار کئے ہیں اور مقام مسرت ہے کہ وہ ان اسباب میں کامیاب بھی ہو رہے ہیں جو اس کی دلیل ہے کہ ان کا پہلا قدم صحیح رستہ پر پڑا ہے غلط راستہ پر نہیں چلا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کا پہلا قدم اتفاقاً صحیح راستہ پر پڑ گیا ہے یا آپ نے قرآن کریم اور سنتِ نبویہ کی روشنی میں اس کو اختیار کیا ہے۔ بہر حال جو صورت بھی ہو اس کے لیے آپ مستحق صد مبارک باد ہیں۔

پہلا قدم مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم

آپ کا یہ پہلا قدم مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم ہے جس کی سخت ضرورت تھی اور اس کی ضرورت سے کسی عاقل کو انکار نہیں ہو سکتا کیونکہ عقلاً و نقلاً یہ مسئلہ اپنی جگہ پر ثابت ہو چکا ہے کہ جو قوم اپنی مستقل تنظیم نہ رکھتی ہو وہ دنیا میں باقی نہیں رہ سکتی بلکہ دوسری اقوام میں منضم اور منجذب ہو کر کالعدم ہو جاتی ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ مسلمانوں کی مستقل تنظیم کی یہی صورت ہے کہ تمام مسلمان اسلامی جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں کیونکہ غیر اسلامی جھنڈے کے نیچے صرف مشترک تنظیم ہی ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کی مستقل تنظیم نہیں ہو سکتی۔ اور مشترک تنظیم کا نفع ہمیشہ اکثریت کو پہنچتا ہے۔ اقلیت کو اس سے کچھ نفع نہیں ہو سکتا اگر وہ اپنی مستقل تنظیم سے محروم ہو۔ پس مدبران لیگ نے بڑی دانش مندی سے کام لیا کہ مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کا اہتمام کیا کہ اس کے بعد ہی مشترک تنظیم سے ان کو نفع ہو سکتا ہے ورنہ وہ ہمیشہ دوسروں کے حاشیہ بردار ہو کر ان کے رحم و کرم پہ رہ جاتے اور کچھ دنوں بعد ان کی ہستی فنا ہو جاتی۔

یہی وہ چیز ہے جس کی طرف آیت کریمہ میں لفظ جندنا سے اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ جند لشکر کو کہتے ہیں اور لشکر اجتماعی شان سے بنتا ہے۔ انفرادی حالت میں کسی قوم کی خواہ وہ کتنی ہی شمار رکھتی ہو لشکر نہیں کہا جا سکتا اور اللہ کا لشکر وہی ہو سکتا ہے جو اللہ کے نام پر منظم ہو وطن پرستی یا قوم پرستی کے نام پر منظم نہ ہوا ہو۔

یہ پہلا قدم تھا جو مسلم لیگ نے صحیح اٹھایا۔ اس کے بعد ایک قدم آگے بڑھانے کی اور ضرورت ہے جس کے بعد کامیابی اور غلبہ کا سہرا آپ کے سر ہو گا۔ خدا کرے آپکا یہ دوسرا قدم بھی صحیح راستہ پہ ہو اور اگر آپ نے قرآن کریم کی ہدایات اور سیدنا رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ اپنے سامنے رکھا اور اسی کو مشعلِ راہ بنایا تو کوئی وجہ نہیں
کہ آپ دوسرے قدم پر غلطی سے دوچار ہوں۔ مسلمانوں کو کسی کے اتباع یا تقلید کی
ضرورت نہیں ان کے گھر میں وہ سب دولتیں جمع ہیں جن کو فلاح اور کامیابی میں
دخل ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مسلمان دوسری قوموں کی تقلید کرکے ترقی کرنا چاہتے
ہیں۔ قرآن کریم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید کرکے ترقی کرنا نہیں چاہتے ہیں حالانکہ
دوسری قوموں کے ذرائع ترقی سے کفار کو اور کفر ہی کو ترقی ہو سکتی ہے مسلمانوں اور اسلام
کو ترقی نہیں ہو سکتی۔ اگر مسلمان مسلمان رہ کر اسلامی ترقی چاہتے ہیں تو ان کو اپنے ماضی کی
طرف لوٹنا چاہیئے اور قرآن کریم اور اسوہ نبویہ کو مشعل راہ بنانا چاہیئے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ
فرماتے ہیں وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ یقیناً ہمارا لشکر ہی ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ یہ
اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اور نہایت مستحکم وعدہ ہے جو کبھی خلاف نہیں ہو سکتا۔ تاریخ شاہد ہے
کہ اللہ تعالیٰ کا لشکر ہی ہمیشہ غالب رہا ہے وہ کسی سے کبھی مغلوب نہیں ہوا اور کبھی اگر اسکے
خلاف ہوا تو اس کا سبب صرف یہی تھا کہ اس لشکر کے خدائی ہونے میں کچھ کسر تھی۔

دوسرا قدم یہ ہے کہ مسلم لیگ اللہ کا لشکر بن جائے

پس مسلم لیگ کو دوسرا قدم اس طرح اٹھانا چاہیئے کہ
اس لشکر کو جسے اس نے اللہ کے نام پر منظم کیا ہے صحیح معنوں میں اللہ کا لشکر بنا دے اس
کے بعد یقیناً وہی غالب اور وہی فتح مند ہوگی اور اس کے سر کامیابی کا سہرا ہوگا۔ حضرات
آپ نے ترقی کے بہت سے اسباب سُنے ہوں گے۔ بہت ذرائع سوچے ہوں گے۔
بہت سے راستے اختیار کیے ہوں گے۔ ذرا اس راستہ کو بھی آزما لیجئے جس کا تجربہ آپ
کے اسلاف نے ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک کیا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ جب تک

وہ اس راستہ پر قائم رہے ہمیشہ غالب و کامیاب رہے اور جس دن اس راہ سے ہٹے
اسی وقت سے زوال اور پستی ان کے سامنے آگئی یہاں تک کہ نوبت اس حال کو پہنچ گئی
جو ہمارے اور آپ کے سامنے ہے۔ تو کیا اب بھی ہم کو اپنے ماضی کی طرف لوٹنے میں کسی
دوسری حالت کا انتظار ہے۔ لِلّٰہ اپنے حال پر رحم کریں اور اس سے زیادہ اپنے کو تختۂ مشق
نہ بنائیے۔

اللہ کا لشکر کیوں کر بنتا ہے

اس کے بعد مجھے کہنے دیجئے کہ صحیح معنوں میں
اللہ کا لشکر کیوں کر بنتا ہے۔ حضرات اس کے
لیے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس لشکر کا ہر فرد جس طرح زبان سے
اللہ اکبر کہتا ہے دل میں بھی اللہ تعالیٰ کو سب سے بڑا جانتا ہو۔ اللہ کا بول بالا کرے اور
اس کو راضی کرنے کے سوا کسی دوسری چیز کا طالب نہ ہو۔ خود پسندی، جاہ پسندی۔ نام اور
عزت کا طالب نہ ہو نہ کسی عہدہ کا خواہش مند ہو۔ ہر شخص خواہ وہ صدر ہو یا نائب صدر
قائد ہو یا سائق اپنے کو اللہ کے لشکر کا سپاہی سمجھتا ہو اور جو کام اس کے سپرد کر دیا جائے
اس پر راضی ہو۔ حضرت خالد بن ولید کو ایک وقت تمام عساکر اسلامیہ کا قائد اعظم بنا دیا
جاتا ہے تو اس عہدہ کے فرائض بخوبی انجام دیتے ہیں۔ دوسرے وقت اس منصب سے
معزول کرکے سپاہی بنا دیے جاتے ہیں تو پہلے سے زیادہ اسلام کی خدمت کا حق ادا
کرتے ہیں۔

دوسری شرط

یہ ہے کہ یہ لشکر اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ کا
مصداق ہو۔ آپس میں مہربان ہمدرد ہوں اور کافروں کے
مقابلہ میں سخت ہوں۔ اس لشکر کا کوئی فرد نہ انگریز پرست ہو نہ ہندو پرست، نہ ہوا پرست

بلکہ سب خدا پرست ہوں۔

تیسری شرط

صحیح معنی میں اللہ کا لشکر بننے کی تیسری شرط یہ ہے کہ اس لشکر کی وضع اور شان ایسی ہو جس کو دیکھ کر ہر شخص پہچان لے کہ یہ اللہ کا لشکر ہے اس کی وضع دشمنان خدا کی وضع سے ممتاز ہو۔ اس کی شان اللہ کے باغیوں کی شان سے الگ ہو۔ اس کا نشان اللہ کے نافرمانوں کے نشان سے جدا ہو۔

تیسری شرط کی سیاسی اہمیت

حضرات یہ مسئلہ محض مذہبی نہیں بلکہ سیاسی مسئلہ بھی ہے۔ ہر نظام سلطنت میں ہر شعبہ کے لیے کوئی نہ کوئی خاص نشان (یونیفارم) مقرر ہے۔ ہر سلطنت کا خاص نشان دوسری سلطنت کے نشان سے جدا ہے اور جس قوم نے جب کبھی ترقی کی ہے اس کی کوشش رہی ہے کہ اس کا نشان (یونیفارم) اس کا کلچر اس کا مذہب، اس کی زبان دوسروں سے ممتاز رہے۔ جو قوم اپنے نشان (یونیفارم) کی محافظ نہیں رہی وہ بہت جلد دوسری اقوام میں منجذب ہو کر فنا ہو گئی۔ مجھے اس مسئلہ کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ سیاست دان طبقہ اس سے بخوبی واقف ہے۔ اس معاملہ میں کانگرسی لیڈروں کی فہم و فراست کی داد دینی چاہیئے کہ انہوں نے مسلمانوں میں کانگرس کی طرف دعوت دینے اور ماس کنٹکٹ کے کام کے لیے ایسے مبلغ تجویز کیئے ہیں جن کی شکل و صورت بالکل اسلام کے مطابق ہوتی ہے اور نماز کے پابند بھی ہوتے ہیں تو کیا مسلم لیگ جو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی کہ اس کے مبلغ بھی وضع اسلامی اور نماز کے پورے پابند ہوں کیونکہ مسلمانوں کا عام طبقہ سیاست کو بعد میں سمجھتا ہے۔ صورت کو پہلے دیکھتا ہے۔ مجھے اس مقام پر آپ سے یہ کہنا ہے کہ اسلام نے اور اسلام کے مکمل اور کامل کرنے والے خدا

نے اسلام کے ہادی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے لیے ایک خاص نشان مقرر کیا ہے جس کی حفاظت اس کے ذمہ ضروری ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ مشرکین کی مخالفت کرو۔ ڈاڑھی بڑھاؤ مونچھیں کترواؤ جس نے مونچھیں نہ ترشوائیں وہ ہم میں سے نہیں، اور اس میں تو کسی مسلمان کو بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر ڈاڑھی تھی۔ حضورؐ کی ریش مبارک کے متبرک بال تو آج بھی تبرکات نبویہ میں بعض جگہ محفوظ ہیں۔ پس ایک مسلمان کو فطرت اور عقل کے اعتبار سے لازم ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے آقا اپنے محبوب اپنے ہادی جیسا رنگ ڈھنگ چال چلن سیرت فیشن وغیرہ بنائے اور اپنے آقا اور محبوب کے دشمنوں کے فیشن اور طرز سے پرہیز کرے۔ عقل و فطرت کا ہمیشہ یہی تقاضا رہا ہے۔

چوتھی شرط

اللہ کے لشکر کے لیے اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ سب کے سب نماز کے پورے پابند ہوں۔ حضرات جنگ آئینی ہو یا غیر آئینی مسلمان کو بجز خدا کے کسی کی امداد کی ضرورت نہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ جب تک مسلمانوں کا ہر فرد اللہ کے لشکر کا سچا سپاہی بنا رہا مسلمان ہمیشہ غالب رہے کیونکہ خدا کی امداد ان کے ساتھ تھی اور جس کے ساتھ خدا ہو اس کو کسی کی ضرورت نہیں ہوتی اور امداد الٰہی کی شرط احکام الٰہی کا اتباع ہے۔ مسلمانوں کی ناکامی کا اصل سبب حب دنیا اور قلت تعلق مع اللہ کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

حضرات مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے۔ دنیوی اسباب و ساز و سامان میں دشمنوں سے ہر زمانہ میں کم رہے مگر تاریخ شاہد ہے کہ باوجود قلت کے وہ ہمیشہ اکثریت پر بھاری رہے اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اللہ کی مدد ان کے ساتھ تھی خدا ان کا تھا وہ خدا

کے تھے۔

حضرات میں آپ کو ترکی یا مصری یا افغانی و ایرانی اسلام کی طرف نہیں بلا رہا اس لیے کسی کو ان ممالک کی نظائر پیش کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میں تو آپ کو اس ترقی کی طرف بلا رہا ہوں جو ساڑھے تیرہ سو برس پہلے مسلمانوں کو نصیب تھی جس نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی اور اس کے لیے ترکِ دنیا کی ضرورت نہیں بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ مسلمان دنیا کا غلام نہ ہو اللہ کا غلام ہو۔ جب مسلمان اللہ کا غلام ہو جاتا ہے تو دنیا کی تمام طاقتیں اس کی غلام ہو جاتی ہیں۔ آپ اس راستہ پر چل کر تو دیکھیں انشاء اللہ آپ ہی غالب اور بلند اور کامیاب ہوں گے کیونکہ یہ وہ حربہ ہے جس کا توڑ مخالف کے پاس نہیں وہ آپ کے ہر حربہ کو توڑ سکتا ہے مگر اس کے پاس اس کا کچھ جواب نہیں کہ اطاعتِ خداوندی کے بعد خدا کی مدد آپ کے ساتھ ہوگی اور اس کے ساتھ نہ ہوگی۔

حضرات آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا دین جامع اور مکمل ہے۔ اس میں سیاست، عبادت اور معاملات سب داخل ہیں۔ جہاں آپ معاملات میں اقتصادی و تجارتی و صنعتی ترقی کی طرف توجہ فرماتے ہیں۔ سیاسی مسائل میں تجاویز منظور فرماتے ہیں وہاں صرف تجاویز ہی نہیں بلکہ عمل ہی عبادت کا لحاظ بھی فرمایئے اور اس کے ساتھ ایک ایسی مجلس شوریٰ کو مسلم لیگ میں شامل فرمائیے جو خالص دینی مسائل میں آپ کو مشورہ دے سیاسی اقتصادی مسائل میں وہ اور اس کا حلقہ اثر جو بہت وسیع ہے آپ کی منظور شدہ تجاویز پر دل و جان سے عمل کرے گا۔

حضرات یہ ظاہر ہے کہ آپ کو تمام مسلمانوں کی تنظیم کرنی ہے اور بہت زیادہ مسلمان وہ ہیں جن پر اب بھی علماء کا اثر زیادہ ہے۔ جب وہ یہ دیکھیں گے کہ علما کی مجلسِ شوریٰ آپ

کے دوش بدوش کام کر رہی ہے۔ آپ کے نظام کے اندر داخل ہے۔ آپ کے اجتماعات میں شامل ہو رہی ہے وہ آپ کی تجاویز پر عمل پیرا ہے اور آپ اس کے مذہبی مشوروں پر عامل ہیں تو اس سے عوام و خواص میں وہ عدیم النظیر اتحاد پیدا ہوگا جس کی مثال ہندوستان میں صدیوں سے ناپید ہے اور مسلم لیگ ایک ایسی حقیقی طاقت و تنظیم حاصل کرے گی جو ہم میں سے ہر مسلمان کا دلی مقصد ہے۔

اس کے ساتھ مجھے امید ہے کہ آپ عمل کے درجہ میں مندرجہ ذیل امور کا بھی خاص لحاظ فرمائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ جس قدر جلد خواص ان امور پر عمل کریں گے۔ اسی قدر عوام میں اس تحریک کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوگی۔

۱۔ ہر مسلمان ممبر کلمہ اسلام کو با معنی یاد کرے اور دوسروں کو یاد کرائے۔ ۲۔ ہر مسلمان ممبر خود بھی نماز پڑھے اور دوسروں کو نمازی بنانا اپنے ذمہ ضروری سمجھے۔ ۳۔ جماعت کی پابندی کی جائے تاکہ مساجد بھی آباد ہوں اور ممبران لیگ کو عامۃ المسلمین سے ارتباط ہو۔ ۴۔ جن مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض ہے ان کو ادائے زکوٰۃ کی ترغیب دی جائے جس سے غربا کو لیگ کے ساتھ ہمدردی بھی ہوگی اور ان کا افلاس بھی کم ہوگا۔ ۵۔ ہر مسلمان ممبر رمضان کی پابندی کرے۔ اگر مسلم لیگ نے ان معروضات پر توجہ کی اور ان کو اپنے مقاصد میں داخل کر لیا اور کسی سب کمیٹی کے حوالہ کر کے معاملہ کو التوا میں نہ ڈالا جیسا کہ آجکل کی سیاست کا اصول ہے بلکہ جلد از جلد اس پر عمل شروع کر دیا تو آپ خود کھلی آنکھوں دیکھ لیں گے کہ لیگ کو چار چاند لگ جائیں گے اور اس کو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوگی۔ اس کے بعد میں آپ کی توجہ ایک خطرہ کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ وہ مسلمان عورتوں کے ارتداد کا خطرہ ہے جو بعض مقامات پر سوہانِ روح بنا ہوا ہے۔ بعض عورتیں جب اپنے شوہروں کا ظلم و جور

یا ان کے مفقود الخبر ہو جاتے یا شوہر کے نامرد یا مجنوں ہونے کی وجہ سے عاجز اور پریشان ہو جاتی ہیں اور عقد نکاح سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا کیونکہ ہندوستان میں دار القضا موجود نہیں ہے جو ان مشکلات کا صحیح حل تھا تو وہ اسلام سے مرتد ہو کر کسی دوسرے مذہب میں چلی جاتی ہیں۔ اس خطرہ کے انسداد کے لیے اسمبلی میں ایک بل پیش کیا گیا تھا جو خلع بل یا کاظمی بل کے نام سے موسوم ہے جس میں ایک دفعہ یہ رکھی گئی تھی کہ مسلمان عورت کے مقدمات نکاح و طلاق وغیرہ کے لیے حاکم مسلم کی عدالت مخصوص کی جائے کیونکہ حاکم غیر مسلم کا فیصلہ اس باب میں لغو اور کالعدم ہے۔ شرعاً اس سے نہ طلاق واقع ہو سکتی ہے اور نہ نکاح فسخ ہو سکتا ہے۔ ایک دفعہ یہ تھی کہ مسلمان شادی شدہ عورت مرتد ہو جائے تو وہ بدستور اپنے شوہر کے نکاح میں رہے گی اگرچہ اس کے ساتھ مباشرت جائز نہ ہوگی مگر نکاح فسخ نہ ہوگا کیونکہ ارتداد کسی شبہ کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس کو محض فسخ نکاح کا آلہ بنایا جاتا ہے ہمیں امید تھی کہ کانگرسی حکومت جو قومی حکومت ہونے کی دعوے دار ہے۔ مسلمانوں کی مشکلات کا احساس کر کے اس بل کو کامیاب بنائے گی مگر ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی کے ہاتھوں اس بل کا جو حشر ہوا وہ اخبار بین طبقہ سے مخفی نہیں کہ وہی دفعات جو اس بل کی جان تھیں اس میں سے خارج کر دی گئیں جس کے بعد یہ بل مسلمانوں کے لیے بجائے مفید ہونے کے مضر ہو جائے گا۔ مسلم لیگ کو سلیکٹ کمیٹی کے اس فیصلہ کے خلاف قوت سے آواز بلند کرنا چاہیئے خاموش نہیں رہنا چاہیئے اور جب تک یہ بل کامیاب نہ ہو برابر کوشش میں لگا رہنا چاہیئے۔ مسلم لیگ کو قوت اور تیزی کے ساتھ عمل کی طرف قدم بڑھانا چاہیئے محض سکیموں اور تجاویز پر اکتفا نہ کرنا چاہیئے۔ بس یہی کامیابی کا راز ہے بشرطیکہ عمل شریعت کے موافق اور نیت خالص اللہ کے واسطے ہو۔ اب میں دعا پر اس پیام کو ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ سب مسلمانوں کو اپنے دین کی خدمت کا جذبہ عطا فرمائیں۔ ہماری نیتوں میں خلوص اور عمل میں برکت اور تدابیر میں کامیابی عطا ہو۔[1]

قائداعظم محمد علی جناح مولانا تھانوی کی نظر میں

تحریکِ پاکستان کے دوران میں علما حضرات کی ایک کثیر تعداد پاکستان کے مخالف کیمپ میں جا بیٹھی تھی اس کیمپ میں جہاں کچھ عالم ایسے تھے جن کا موقف خلوص پر مبنی تھا وہاں کچھ نام نہاد علما ایسے بھی تھے جو دینی علم میں صفر اور سیاست کی ابجد سے ناآشنا لیکن مسلم لیگ کی قیادت پر شرعی اعتراض کرنے میں پیش پیش تھے اور قائداعظم کو کافرِ اعظم تک کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ علما کی ایک جماعت نہ صرف تحریک پاکستان کی دل و جان سے حامی بلکہ قائداعظم کے بارے میں نہایت اعلیٰ خیالات رکھتی تھی۔ مولانا تھانوی اس جماعت کی قیادت کر رہے تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح اور مولانا تھانوی کے درمیان باقاعدہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا جیسا کہ مولانا تھانوی کے مندرجہ ذیل ملفوظ سے ظاہر ہے۔ اس ملفوظ سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا تھانوی قائداعظم کے بارے میں نہایت عمدہ رائے رکھتے تھے۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء کو مولانا تھانوی نے ایک مجلس میں دوران گفتگو فرمایا "جس زمانہ میں مسلم لیگ اور کانگرس میں مفاہمت کی گفتگو ہو رہی تھی میں نے ایک

۱۔ "خطاب بہ مسلم لیگ" (بھارت الیکٹرک پریس سہارن پور، ۱۳۵۷) ماہنامہ طلوع اسلام" (دہلی)، ۱۹۳۹ء، ص ۶۵-۶۶۔ روزنامہ "عصر جدید" کلکتہ ۴ جنوری ۱۹۳۹ء ص ۱ + ۶۔

خط مسلم لیگ کے صدر جناح صاحب کو اس مضمون کا لکھا کہ مفاہمت میں چونکہ مسلمانوں کے امور دینیہ کی حفاظت نہایت اہم اور ضروری ہے آپ شرعی مسائل میں اپنی رائے کو دخل نہ کریں بلکہ محققین سے پوچھ لیا کیجیے۔ اس پر انہوں نے نہایت شرافت سے جواب دیا اور اطمینان دلایا کہ آپ کی ہدایت کے مطابق عمل کیا جائے گا۔"(۱)

ایک خط قائداعظم کی طرف سے لکھا گیا جس میں آپ نے تحریر فرمایا کہ "مجھ کو ظہیر الدین نیز نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب سے گفتگو کرنے کا موقع ملا اور یہ معلوم کر کے بہت خوش ہوا ہوں کہ آپ کو آل انڈیا مسلم لیگ کے مقصد اور پروگرام سے پوری ہمدردی ہے مجھ کو آپ کا خط ملا لیکن موجودہ متعدد مشاغل اور عدم حاضری بمبئی کے سبب آپ کو اس سے قبل جواب نہ دے سکا۔ چند نکات جو میرے سامنے پیش کئے گئے ہیں میں نے ان کو بغور تحریر کر لیا ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ان کے متعلق آپ سے ضرور مشورہ کروں گا جب وقت آئے گا۔ آپ کی مہربانی"۔(۲)

خوش قسمتی سے اسلام آباد میں محفوظ قائداعظم کے کاغذات میں مولانا تھانوی کا ایک اور خط بنام قائدِاعظم دستیاب ہوا ہے۔ یہ خط ۱۹۳۸ء میں لکھا گیا۔ مولانا تھانوی کے دل میں قائداعظم محمد علی جناح کے لیے جس قدر عزت اور احترام موجود تھا۔ اس خط کا ایک ایک لفظ اور سطر اس کی نشاندہی کر رہا ہے کہ ہندوستان کا ایک جید عالم دین "قائداعظم کے "الطاف نامہ" آنے کو فخر سمجھ رہا ہے۔ خط کا متن ملاحظہ ہو۔

مکرمی و محترمی دام مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ الطاف نامہ نے مسرور و ممنون اور غایت درجہ

۱۔ افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص ۹۶

۲۔ مفتی محمد شفیع مجالس حکیم الامت (دارالاشاعت کراچی ۱۹۷۷ء) ص ۲۸۷

مطمئن فرمایا۔ دل سے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دین اسلام کی قوت کا ذریعہ بنا دیں۔ میں بکثرت دعا میں مشغول رہتا ہوں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔ واقعی جیسا کہ آپ نے تحریر فرمایا ہے آپ کے بہت سے مشاغل ہیں اور بہت اہم ہیں اور میں ایک منٹ کے لیے بھی گوارا نہیں کرتا کہ ان میں کسی درجے کا بھی حرج ہو۔ اس بناء پر بلا تکلف عرض کرتا ہوں کہ میری معروضات کے جواب دینے کا اہتمام نہ فرمایا جائے۔ میں انتظار نہ کروں گا صرف اس کی اجازت دینا کافی ہوگا کہ کسی وقت کوئی مفید بات میرے ذہن میں آئے تو اس کو عرض کر دیا کروں اور وہ آپ کے پیش نظر رہے۔ البتہ اگر میرے لائق کوئی خدمت یا مشورہ کی غرض سے کوئی استفسار ابتدا میں ذہن عالی میں آ وے تو الطاف نامہ آنے کو فخر سمجھوں گا" (۱)

مولانا تھانوی نے ایک مرتبہ مجلس میں فرمایا "میں خواب بہت کم دیکھتا ہوں مگر جب دیکھتا ہوں تو اکثر صحیح ہوتا ہے۔ میں نے خواب دیکھا گویا میدان حشر قائم ہے۔ اور کچھ حضرات کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ یہ علماء و صلحاء کا گروہ تھا۔ میں نے دیکھا تو مسٹر جناح بھی ایک عبا پہنے اس گروہ میں کرسی پر بیٹھے ہیں میرے دل میں یہ خیال آیا کہ مسٹر جناح اس گروہ میں کس طرح شامل ہو گئے ہیں تو معاً ایک بزرگ نے جواب دیا کہ مسٹر جناح آج کل مسلمانوں اور اسلام کی بہت خدمت کر رہے ہیں اس لیے ان کو یہ اعزاز بخشا گیا ہے۔" یہ خواب کلکتہ کے اخبار عصر جدید میں بھی شائع ہوا تھا۔

مولانا تھانوی قائداعظم محمد علی جناح کو پکا راسخ مسلمان اور اسلام کا خادم سمجھتے تھے اس کی تائید مولانا ظفر علی خان نے اپنی ایک نظم بڑا مولوی میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے۔

Qaide Azam Papers File NO 1906 P.294 (3)

اس نظم میں ان علماء پر طنز کی گئی جو متحدہ قومیت کے حامی تھے اور قائداعظم کے مذہبی رجحانات کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھے۔"(۱)

وطن جس کی رو سے ہے بنیادِ ملت — مَیں اس کی شرع کی کرتا پیروی ہوں
سکھاتا ہے جو ناچنا اور گانا — مَیں اس مدرسہ کا بڑا مولوی ہوں
مجھے لیگ سے اس لیے دشمنی ہے — وہ عبدالنصاری ہیں مَیں عبدالقوی ہوں

سمجھ لوں میں جینا کو کیونکر مسلماں
کوئی مَیں بھی اشرف علی تھانوی ہوں

علیحدہ مملکت کا تصور اور آرزو

مولانا تھانوی مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کے قیام کے خواہش مند تھے اور اسی لیے بارہا اپنے ملفوظات میں اپنی اس خواہش کا اظہار فرماتے رہے۔ آپ کے ملفوظات کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپ کے نزدیک مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کا قیام ان کے تمدن، مذہب اور رسوم و رواج کے تحفظ کے لیے کس قدر ضروری تھا۔ اس کے لیے آپ نے بار بار مسلمانوں کا مرکز کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے خیال میں علیحدہ مملکت کا تصور سب سے پہلے حضرت تھانوی کے یہاں ہی سنا گیا۔ آپ نے اس سلسلے میں تحریر فرمایا کہ "یاد کر لیجئے کہ ۱۹۲۸ء کا زمانہ تھا اور ایک مخاطب روزنامہ ہمدرد کا ڈائریکٹر تھا۔ صبح اور دوپہر کی طویل صحبت میں سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آجانا ناگزیر سا تھا۔ گفت گو ہوئی حضرت نے اتنی معقولیت سے گفتگو کی

۱- مولانا ظفر علی خاں چمنستان (مکتبہ کاروان لاہور ۱۹۶۹ء) ۱۴۳/۱۴۴

کہ ساری بدگمانیاں دور ہوگئیں۔ پاکستان کا تخیل خالص اور اسلامی ریاست کا خیال یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں۔ پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہی کانوں میں پڑی تھیں"(۱)

مولانا تھانوی نے اپنی ایک مجلس میں دورانِ گفتگو فرمایا "جو اصل چیز ہے کہ مسلمانوں میں دین پیدا ہو۔ ان کی قوت ایک مرکز پر جمع ہو ان کا کوئی امیر ہو اس کا کہیں نام و نشان نہیں۔ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر مسلمان مضبوطی کے ساتھ اپنے دین کے پابند ہو جائیں اور اپنی قوت کو ایک مرکز پر جمع کر لیں اور جس کو اپنا خیر خواہ سمجھیں اس کو اپنا امیر بنا لیں اور اس کے مشورے پر عمل کریں تو پھر ان کو کسی کی شرکت کی ضرورت نہ ہو نہ ان کو کسی سے خوف کی کوئی ضرورت ہوگی۔" (۲)

۱۹۳۸ء میں ایک انتخاب کے سلسلے میں مسلم لیگ نے تھانہ بھون میں جلسہ منعقد کیا۔ اس جلسے کی انعقاد کی اجازت خود مولانا تھانوی نے مرحمت فرمائی تھی۔ اسی جلسہ میں مولانا کے ایک خادم خاص حافظ جلیل احمد شروانی نے بھی شرکت کی۔ جلسہ کے اختتام پر حافظ صاحب نے مولانا تھانوی کو جلسہ کی کارروائی سے آگاہ کیا۔ حافظ جلیل احمد نے لکھا "پس احقر مبارک یہ بیان سن کر اور کثیر الاجتماع جلسہ سے فارغ ہو کر خانقاہ میں حاضر ہوا تو دوپہر کا وقت تھا۔ دیکھا کہ حضرت مرشدی حکیم الامت سہ دری میں رونق افروز ہیں۔ احقر نے اس جلسہ کا حال بیان کیا اور اس دوران مجھ پر گریہ طاری ہوگیا۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت دیکھ کر حضرت نے ایک تقریر فرمائی۔ اس تقریر کے دوران میں حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ فلاں صاحب اس زمانے میں میرے پاس وہ مضمون لکھ کر لائے جو اس جلسہ میں میری

۱- حکیم الامت ص ۴۳

۲- الافاضات الیومیہ جلد اول ص ۸۵

طرف سے پڑھا گیا تو اس مضمون کے اندر لکھا کہ جب لوگوں کو نماز کی ترغیب دی جاتی ہے تو وہ جواب میں یوں کہتے ہیں کہ خالی نماز پڑھنے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ لوگ یورپ کے ملاحدہ کے مقلد ہیں۔ مسلمانوں کا غلبہ دونوں ہی چیزوں پر موقوف ہے۔ میری یہ رائے آج سے نہیں بلکہ ہمیشہ سے ہے۔

اس کے بعد مجھ سے دریافت کیا کہ مسلمانوں کو قتال کی اجازت ہجرت کے بعد ہوئی اس کی کیا وجہ ہے۔ قتال کی اس قدر ضرورت تھی مگر جب تک ہجرت نہ ہوئی اس وقت تک اجازت نہ ملی تھی۔ احقر نے بیان کیا کہ مسلمانوں کے پاس ہتھیار نہ تھا اور سامان نہ تھا ارشاد فرمایا "اجی ہتھیار تو خود مقابل سے لیے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کا مکہ میں مرکز کوئی نہ تھا اور جہاد کے لیے مرکز ضروری ہے۔ ہجرت کے بعد جب مسلمانوں کو مرکز حاصل ہو گیا تب اس کی اجازت ہوئی۔ اب اس وقت بھی مسلمانوں کے لیے دشواری یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز نہیں لہٰذا سخت ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز قائم ہو۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ان کے اندر کوئی امیر المومنین ہو جو تمام صفات رکھتا ہو ایک تو دین دوسرے سیاست تیسرے ان کے اندر ہمت بھی ہو۔" (۱)

۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء کو ایک مجلس میں فرمایا "معلوم نہیں ان تحریکات کا انجام کیا ہو گا مگر مجھ کو ابھی امید ہے کہ انشاء اللہ خیر عظیم کا ظہور ہونے والا ہے۔ میں ابھی تک مایوس نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جنات کا اس وقت کا مقولہ جب کہ وہ اور شیاطین آسمان پر جاتے تھے تو ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے تھے۔ نقل فرمایا ہے وانا لا ندری اشر ارید بمن فی الارض ام اراد بھم ربھم رشدا یعنی ہم نہیں جانتے کہ اس نئے نظام سے کیا

۱۔ حافظ جلیل احمد شروانی آثار رحمت (لاہور سن ندارد) ۱۱۹ - ۱۲۱

ظہور پذیر ہو گا۔ اس سے اہل زمین کو ضرر پہنچے گا یا اللہ تعالیٰ ان کو نفع پہنچانا چاہتے ہیں بالکل اسی طرح ان تحریکات میں دونوں احتمالات ہیں گو جنات کا یہ مقولہ محل خیر میں تردد کا تھا اور میرا محل شر میں تردد کا تھا مگر میرا خیال وہی ہے جو میں اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں۔ میری دلی تمنا اور دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حکومت عادلہ مسلمہ قائم فرما دے اور میں اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ (۱)

آرمی بل

۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کے بادل مطلع سیاست پر منڈلانا شروع ہو گئے تھے۔ ہٹلر کی بڑھتی ہوئی جارحانہ کارروائی نے تمام دنیا کو پریشان و سراسیمہ کر دیا تھا چنانچہ حکومت ہند کو بھی یہ خطرہ لاحق ہوا کہ اگر یورپ میں جنگ چھڑ گئی تو ہندوستان میں فوجی بھرتی کا کام وسیع پیمانے پر کرنا پڑے گا۔ ہندوستان میں فوجی بھرتی کا سب سے بڑا مرکز پنجاب تھا جہاں انگریزوں نے بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کا تانا بن رکھا تھا تاکہ ان کی وساطت سے نوجوان ملتے رہیں اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات نے ان مخدوش حالات میں حکومت ہند کو ایک تحریک پیش کی کہ فوجی بھرتی کی مخالفت کرنے والوں کو سزا دی جائے تاکہ برطانوی حکومت کو فوج مہیا کرنے کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ چنانچہ حکومت ہند نے ۱۵ اگست ۱۹۳۹ء کو مرکزی اسمبلی میں فوجی بھرتی کا قانون بنانے کی غرض سے ایک بل پیش کیا۔ ادھر آل انڈیا مسلم لیگ نے اس بل کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا اور مسلم لیگ پارلیمانی

۱۔ اسعد الابرار ص ۱۳۷

پارٹی کی طرف سے میر غلام بھیک نیرنگ، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں اور قائداعظم محمد علی جناح نے اس بل کی حمایت میں تقاریر کیں۔ اس کے برعکس کانگریس نے اس بل کی مخالفت کی۔ بل پر تقریر کرتے ہوئے بھولا بھائی ڈیسائی نے بل کی حمایت کرنے والوں کو "غدار" قرار دیا۔[۱]

لیکن کانگریس کا اصل مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ ہندوستانیوں کو جنگ میں جھونکنے کی مخالفت کر رہی تھی بلکہ اس کی اس کارروائی کے پیچھے یہ مصلحت کارفرما تھی کہ فوج میں مسلمانوں کا تناسب کم کیا جا سکے۔ اس کا ثبوت اس بات سے مل جاتا ہے کہ جس زمانہ میں ہندوستان میں آرمی بل پر بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری تھا اس زمانہ میں برطانوی حکومت نے ہندوستانی فوج کی از سر نو تنظیم کے سلسلے میں ایک رپورٹ تیار کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی قائم کی۔ یہ کمیٹی نومبر ۱۹۳۰ء میں بمبئی پہنچی۔ اگرچہ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے اس کمیٹی کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا مگر اس کمیٹی کے صدر جب بمبئی پہنچے تو گورنر بمبئی نے انہیں مطلع کیا کہ صوبے کے دو وزیر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ دونوں وزیر (بی جی کھیر اور کے ایم منشی) لارڈ چیٹفیلڈ سے ملے اور ان سے گلہ کیا کہ یہ کیا اندھیر ہے کہ آپ ہندوستانی فوج میں مسلمانوں کو اتنی کثرت سے بھرتی کر رہے ہیں کیا ہندو مر گئے ہیں۔[۲] کانگریس چاہتی تھی کہ فوج میں نہ صرف مسلمانوں کا تناسب کم کیا جائے بلکہ ہندوؤں کو زیادہ سے زیادہ عہدے اور مناصب ملیں۔ لیکن وہ اپنے اصلی ارادوں کو ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قائداعظم محمد علی جناح نے فرمایا کہ "میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ

۱۔ ہماری قومی جدوجہد ۱۹۳۰ ص ۴۶-۴۷

۲۔ ہماری قومی جدوجہد ۱۹۳۰ ص ۴۹

اس بل کا تعلق قطعاً فرقہ وارانہ مسئلہ سے نہیں اور نہ اس بحث میں فرقہ پرستی کا شائبہ داخل کرنا چاہتا ہوں۔ تاہم میں کانگریسی ممبروں کی تقریروں کا اس نکتہ نظر سے تجزیہ کروں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خاص طور پر مسلمانوں کو اپنے جوشِ بیان کا ہدف بنایا ہے۔ کہیں تو انہوں نے مسلمانوں کے جذبات سے اپیل کی ہے کہیں انہیں ڈرانے دھمکانے اور طعن و تشنیع سے مرعوب کرنے کی کوشش کی ہے اور کہیں مسلم لیگ کے ممبروں کو ڈانٹ پلائی گئی ہے۔"

چونکہ مسلم لیگ اس بل کی حمایت کر رہی تھی اس لیے بڑے شدومد سے یہ پراپیگنڈہ کیا گیا کہ چونکہ مسلم لیگ انگریزوں کی حامی اور ہندوستان میں ان کے مستقل قیام کی خواہشمند ہے اس لیے وہ آرمی بل کی حمایت کر رہی ہے۔ کانگریس کا مؤثر پراپیگنڈہ مولانا تھانوی تک بھی پہنچا۔ چنانچہ آپ نے اصل صورتِ حال سے آگاہی کی خاطر قائداعظم کے پاس مولانا شبیر علی تھانوی، مولانا مفتی محمد شفیع اور مولانا ظفر احمد عثمانی پر مشتمل ایک وفد بھیجا اس وفد نے قائداعظم سے ملاقات کی اور اس سلسلے میں مسلم لیگ کے موقف کی صحت سے آگاہی چاہی۔ مولانا ظفر احمد عثمانی نے راقم کو اس ملاقات کے متعلق لکھا کہ "آرمی بل کی کانگریس نے مخالفت اور مسلم لیگ نے موافقت کی تو اس پر بہت لے دے ہوئی تھی کہ مسلم لیگ سرکار پرست جماعت ہے۔ حضرت حکیم الامت نے اس کی تحقیق کے لیے ایک وفد دہلی بھیجا۔ ہم نے قائداعظم سے پوچھا کہ آپ اس بل کی حمایت کیوں کر رہے ہیں۔ قائداعظم کا جواب تھا کہ کانگریس بھی آرمی بل کی مخالفت نہیں کر رہی ہے بلکہ وہ یہ شرط لگا رہی ہے کہ فوج میں آبادی کے تناسب سے بھرتی کی جائے کیونکہ اس وقت ساٹھ فی صد مسلمان فوج میں ہیں اگر آبادی کے تناسب سے بھرتی کی جاتی تو مسلمانوں کی تعداد پچیس فی صد رہ جاتی۔ انگریزوں نے کہا کہ اس وقت جو صورتِ حال ہے اس کو بدلنا مشکل ہے۔ اس پر ہندو لیڈر ڈاکٹر مونجے نے کہا تھا کہ ہمارے عسکری کالج میں ایک لاکھ نوجوان تعلیم پا رہے ہیں۔

ایک سال میں آپ کو ایک لاکھ تربیت یافتہ فوج مل جائے گی۔ انگریزوں نے کہا کہ ہمیں اس وقت ضرورت ہے، خطرہ سر پہ ہے۔ انتظار دشوار ہے۔ قائد اعظم نے فرمایا کہ انقلاب آنے والا ہے۔ ہندوستانی فوج میں مسلمانوں کی تعداد کم ہوئی تو مسلمانوں کا قتل عام ہو جائے گا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ فوج میں مسلمانوں کی جو اکثریت قائم ہے وہ قائم رہے۔ اس لیے میں نے آدمی بل کی حمایت اس شرط پہ کی تھی کہ مسلمان فوج کو مسلمانوں کے مقابلے میں نہ بھیجا جائے جس کو حکومت نے منظور کر لیا اور فوج میں مسلمانوں کا جو تناسب تھا اس کو بھی بدستور قائم رکھنے کا حکومت نے وعدہ کیا۔ اس وجہ سے میں نے اس بل کی حمایت کی ـــــــ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان فوج میں زیادہ سے زیادہ ہوں اور ان کو توپ بندوق چلانا آجائے۔

قائد اعظم کے اس بیان سے وفد مطمئن ہو گیا۔ بعد میں تھانہ بھون واپس پہنچ کر جب ممبران وفد نے مولانا تھانوی کو اصل صورت حال سے آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ اب معلوم ہوا کہ جناح صاحب نے اس بل کی موافقت انگریزوں کی ہمدردی میں نہیں بلکہ مسلمانوں کی ہمدردی میں کی تھی"۔ (۱)

مسلم لیگ کی حمایت کرنے پر قتل کی دھمکی

مولانا تھانوی نے جب آل انڈیا مسلم لیگ کی مشروط حمایت شروع کی تو مخالف گروپ میں اس کا شدید ردعمل ہوا۔ روزنامہ الامان کے ایڈیٹر مولانا مظہر الدین پہلے ہی قتل کیے جا چکے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا تھانوی کو بھی ایک دھمکی آمیز خط لکھا گیا

(۱) مکتوب مولانا ظفر احمد عثمانی بنام راقم ۳ شوال ۱۳۸۶ھ

جس میں کہا گیا کہ آپ نے مسلم لیگ کی حمایت جاری رکھی تو آپ کو قتل کر دیا جائے گا۔ یہ گمنام خط ۱۳ اپریل ۱۹۳۹ء کو لکھا گیا۔ اس کے لفافے پر مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ کی مہر تھی اور تھانہ بھون کے ڈاک خانہ کی ۱۵ اپریل کی مہر لگی ہوئی تھی۔ اس تہدیدی خط میں لکھا گیا کہ "مولوی اشرف علی تھانوی یہ بات ہمارے لیے بہت تشویش اور شرم کی ہے کہ کانگریس، جمعیۃ العلماء ہند، احرار اور مومن کانفرنس کی تمام کوششوں کے باوجود مسلم لیگ کا فتنہ تمام ملک میں پھیلتا جا رہا ہے اور آپ نے علماء کے خلاف مسلم لیگ کے موافق فتویٰ دیا ہے جس کا بہت اثر ہوا ہے۔ اب ہماری پارٹی مسلم لیگ کے بددین مولویوں کو مزا چکھانے کے لیے میدان میں آگئی ہے۔ اس لیے آپ کو بھی تاکیدی نوٹس دیا جاتا ہے کہ آپ ایک ماہ کے اندر اندر اپنا فتویٰ واپس لے لیں اور حضرت امیر الہند مولانا حسین احمد مدنی کا مسلک قبول کر لو اور کانگریس کی حمایت کرو ورنہ بیقین اور پورا یقین رکھو کہ تم کو بھی مولانا مظہر الدین الامان والے کی طرح تمہاری خانقاہ میں ذبح کر دیا جائے گا۔ یہ قسمیہ اور ایمانا اطلاع بھیجی جاتی ہے۔ ایک ماہ کی مدت غنیمت جاننا۔ ایک ماہ تمہارے جواب کی انتظاری کر کے ہمارا آدمی روانہ ہو جائے گا جو پستول اور چھرے سے تم کو ختم کر دے گا پھر مردود جینا (جناح) اور بدعتی مولوی بدایونی کی باری ہوگی۔ یہ چھٹی کوئی دھمکی نہیں ہے فقط کانگریس زندہ باد جمعیۃ العلماء ہند زندہ باد"۔ (۱)

قیام پاکستان کی پیشین گوئی

مولانا تھانوی نے نہ صرف مسلم لیگ کی تائید میں فتویٰ جاری کیے اور اپنے مریدوں

(۱) افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ ص ۸۲

اور احباب کو مسلم لیگ کی عملی امداد کی تلقین کی بلکہ ۱۹۳۰ء میں اپنے برادرِ نسبتی سعید احمد عثمانی سے قیامِ پاکستان کے متعلق پیشنگوئی بھی فرما دی تھی سعید احمد عثمانی نے راقم کو اس واقعہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا "حکیم الامت مجھ سے باپ کی طرح شفقت فرماتے تعلیم کے سلسلے میں کم و بیش میرا ان کا ساتھ ایک ہی گھر میں بارہ تیرہ سال رہا اور بعض باتیں جو حضرت سے دوسرے لوگ نہیں کہہ سکتے تھے میں گستاخ کہہ دیتا اور مرحوم بہت تحمل سے ان کے حسن و قبح پر غور کر کے مانتے یا رد کر دیتے تھے۔ جس واقعہ کی آپ کو جستجو ہے وہ یوں ہے کہ چند اعزا مجھ سے مولانا ظفر احمد عثمانی کے مکان پر سیاسیات پر گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے دورانِ گفتگو میں کہا کہ جب تک غدار علماء کو ختم نہ کیا جائے گا کامیابی مشکل ہے۔ اس پر علی ساجد صاحب نے فرمایا کہ آپ تو نازکسٹ ہیں۔ غرض ہماری گفتگو ہماری ہمشیرہ صاحبہ نے سنی۔ ظاہر ہے بھائی کی طرف سے ان کو پریشانی ہوئی۔ ان دنوں میری سہارنپور کانگرس سے بہت چلی ہوئی تھی۔ میں ڈسٹرکٹ بورڈ سہارنپور میں ملازم تھا۔ کانگرسی میرے سخت خلاف تھے اور اس زمانہ میں مجھ کو معطل کیا ہوا تھا۔ ہمشیرہ صاحبہ نے میری تمام گفتگو حضرت سے بیان کر دی۔ اس رات تقریباً ڈھائی تین بجے حضرت نے مجھ کو بیدار کیا اور فرمایا کہ کیا تم اس گاڑی سے جاؤ گے جو ساڑھے تین بجے جاتی ہے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ فرمایا ضروریات سے فارغ ہو کر مجھ سے مل لینا ضروری بات کرنی ہے۔ میں سخت پریشان ہوا کہ کیا بات ہو گی جلدی سے فارغ ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ چوکی پر قبلہ رو ہو کر اپنے اوراد میں مشغول تھے، مجھ کو دیکھ کر اپنے پاس بٹھایا اور فرمایا "شب مجھے تمہارے خیالات کا علم ہوا گھبرانے کی کوئی بات نہیں مجھے بہت سے مجذوبوں نے بتلایا ہے کہ اسلامی سلطنت ۱۹۴۷ء میں قائم ہو جائے گی۔(۱)

(۱) مکتوب گرامی سعید احمد عثمانی صاحب بنام راقم ۱۰ جنوری ۱۹۶۹ء

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کی دعوت

آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ۲۴ اپریل ۱۹۴۳ء کو دہلی میں منعقد ہوا۔ مسلم لیگ کی طرف سے مولانا تھانوی کو اس اجلاس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ دعوت نامے میں آپ سے استدعا کی گئی کہ آپ اس موقع پر تشریف لا کر اپنے ارشادات سے مجلس کو ہدایت فرمائیں تو بہتر ہے لیکن اگر حضور تشریف نہ لا سکیں تو اپنے نمائندہ کو بھیج کر مشکور فرمائیں اور دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس اجتماع کے رعب سے غیر مسلموں کے دلوں کو مسحور کر دے اور ہمارا مطالبہ پاکستان منوا دے تاکہ اسلامی سلطنت قائم ہو سکے۔"(۱)

مولانا تھانوی اس زمانہ میں سخت بیمار تھے اس لیے آپ نے شرکت سے معذوری کا اظہار کرتے ہوئے مندرجہ ذیل خط تحریر کیا۔

"از ناکارہ آوارہ ننگ انام اشرف برائے نام۔ بخدمت ارکان مسلم لیگ نصرھم اللہ وانصرھم اللہ السلام علیکم: لیگ کے عزائم معلوم کر کے اس آیت پر عمل کی توفیق ہوئی قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذالک فلیفرحوا "لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عذر نہ ہوتا تو اس آیت پر عمل کرتا" انفروا خفافا و ثقالا" لیکن عذر کے سبب اس رخصت پر عمل کی اجازت مل گئی" لیس علی الضعفاء ولا علی المرضیٰ ولا علی الذین لا یجدون ما ینفقون" لیکن اس کے ساتھ ہی اس آیت کا شرف حاصل ہو گیا کہ اپنی دو کتابوں کا پتہ دیتا ہوں جو انشاء اللہ قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے پیام عمل ہے۔ ایک حیوٰۃ المسلمین شخصی اصلاح کے لیے دوسری صیانۃ المسلمین جمہوری نظام کے لیے ان کے

۱۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب۔ خاتمہ السوانح (ایم ثناء اللہ لاہور ۱۹۶۳ء) ص ۱۷۱/۱۷۲۔

مضامین اپنے موضوع پر گو رنگین نہیں مگر سنگین ضرور ہیں جس میں وہی فرق ہے جو ذوق اور غالب کے اشعار میں اور محمود خان اور محمد صادق کے نسخوں میں ہے اور نمائشہ وہ کام نہیں کر سکتا جو یہ کتابیں کر سکتی ہیں۔ مگر شرط عمل ہے جیسے اعلیٰ درجہ کا ماء اللحم بوتلوں میں بھرا قیمتی ہے مگر نتیجہ خیز نہیں۔ یہ نفع اس وقت ظاہر ہوگا جب حلق سے اترے گا ورنہ بدون عمل یہ سب کوششیں اس کا مصداق ہوں گی کہ نشستند و گفتند و برخاستند۔ باقی دعا ہر حال میں خصوص ان تاریخوں میں زیادہ اہتمام سے جاری رکھوں گا۔

نوٹ: اگر یہ کتابیں مل گئیں تو ۲۲ اپریل کو ڈاک سے ہدیۃً روانہ کر دوں گا ورنہ دہلی میں کسی تجارتی کتب خانہ سے تلاش کی جائیں۔ والسلام احقر اشرف علی تھانوی

ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ

مولانا تھانوی کی وفات پر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی تعزیتی قرارداد

مولانا تھانوی ایک طویل عرصہ سے بیمار چلے آتے تھے۔ بالآخر ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء کو آپ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ مولانا تھانوی کو علمی دنیا میں جو مقام حاصل تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کی وفات پر آپ کے سیاسی مخالفین نے بھی آپ کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ بجنور کے مشہور نیشنلسٹ اخبار مدینہ نے تعزیتی نوٹ میں لکھا "اگرچہ ہم مولانا کے سیاسی نظریات سے متفق نہیں ہوئے لیکن اس کے باوجود ان کے علم، تقویٰ اور دینداری کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ مولانا ایک بہت بڑے مفسر، عالم اور

اعلیٰ درجہ کے مقرر تھے لیکن ان کی سب سے بڑی خاصیت یہ تھی کہ وہ اپنے دشمنوں کے خلاف بھی کوئی لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ (۱)

مولانا تھانوی کی وفات پر آل انڈیا مسلم لیگ نے جو تعزیتی قرارداد پاس کی اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم لیگ کے حلقوں میں مولانا کو کیا مرتبہ و مقام حاصل تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ۱۲ نومبر ۱۹۴۳ء کو مندرجہ ذیل تعزیتی قرارداد پاس کی "آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا یہ اجلاس حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے مولانا مرحوم ایک جید عالم تھے انہوں نے سینکڑوں کتابیں لکھیں۔ لاکھوں لوگ ان کے مرید تھے اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں انہوں نے جو خدمات انجام دیں ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے ان کی وفات مسلم لیگ کے لیے اس وجہ سے مزید دکھ کا باعث ہوئی کہ مولانا کی تائید و حمایت اس کے لیے بہت مددگار ثابت ہوئی جس کی وجہ سے مسلم لیگ نے خود غرض اور گمراہ طاقتوں کا مقابلہ کیا جو مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ کونسل کا یہ اجلاس خداوند کریم سے دعا کرتا ہے کہ مولانا کی روح کو سکون پہنچے اور ان کی روح بدستور ان مسلمانوں کی رہنمائی کرتی رہے جو مسلم انڈیا کی وحدت کے لیے کام کر رہے ہیں۔ کونسل کا یہ اجلاس مولانا کے خاندان اور ان کے لاکھوں مریدوں سے بھی دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے"۔ (۲)

۱۔ خاتمہ السوانح ص ۱۵۸ - ۱۵۹۔

کتابیات

۱۔ ابرارالحق حقی، مولانا — اسعدالابرار — (بارہ بنکی ۱۹۳۸ء)

۲۔ ابوالحسن — فرموداتِ مدنی — (بارہ بنکی۔ سن ندارد)

۳۔ احمد سعید — گفتارِ قائدِ اعظم — (قومی کمیشن برائے تحقیق تاریخ و ثقافت اسلام آباد ۱۹۷۶ء)

۴۔ اشتیاق حسین قریشی — برعظیم پاک و ہند کی ملّت اسلامیہ — (ادارہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی۔ ۱۹۶۸ء)

۵۔ اشرف علی تھانوی، مولانا — الافاضات الیومیہ جلد اول — اشرف المطابع تھانہ بھون سن ندارد

۶۔ اشرف علی تھانوی، مولانا — الافاضات الیومیہ جلد دوم — ادارہ اشرفیہ کراچی۔ سن ندارد

۷۔ اشرف علی تھانوی، مولانا — الافاضات الیومیہ جلد سوم — اشرف المطابع تھانہ بھون سن ندارد

۸۔ اشرف علی تھانوی، مولانا — الافاضات الیومیہ جلد چہارم — اشرف المطابع تھانہ بھون سن ندارد

۹۔ اشرف علی تھانوی، مولانا — الافاضات الیومیہ جلد پنجم — اشرف المطابع تھانہ بھون سن ندارد

۱۰۔ اشرف علی تھانوی، مولانا — الافاضات الیومیہ جلد ششم — اشرف المطابع تھانہ بھون ۱۹۳۵ء

۱۱۔ اشرف علی تھانوی، مولانا — الافاضات الیومیہ جلد ہفتم — اشرف المطابع تھانہ بھون سن ندارد

۱۲۔ اشرف علی تھانوی، مولانا — امداد الفتاویٰ جلد چہارم — ادارہ اشرف العلوم کراچی۔ سن ندارد

۱۳۔ اشرف علی تھانوی، مولانا — خطاب بہ مسلم لیگ — بھارت الیکٹرک پریس سہارنپور۔ ۱۳۵۷ھ

۱۴۔ اکرام اللہ ندوی — وقارِ حیات — مسلم یونیورسٹی پریس۔ علی گڑھ۔ ۱۹۲۵ء

۱۵۔ امین زبیری — حیاتِ محسن — مسلم یونیورسٹی پریس۔ علی گڑھ ۱۹۳۴ء

۱۶۔ امین زبیری — سیاست ملیہ — عزیزی پریس۔ آگرہ۔ ۱۹۴۱ء

۱۷۔ امین زبیری — ضیائے حیات — کراچی ۱۹۵۳ء

۱۸۔ انوار الحسن شیرکوٹی — تجلیاتِ عثمانی — نشر المعارف۔ ملتان ۱۹۵۷ء

۱۹۔ بشیر احمد ڈار — انوارِ اقبال — اقبال اکادمی۔ کراچی ۱۹۶۷ء

۲۰۔ جلیل احمد شروانی حافظ — آثارِ رحمت — لاہور۔ سن ندارد

۲۱۔ جلیل احمد شروانی حافظ — القول الجلیل — مکتبہ نشر القرآن۔ سہارنپور۔ سن ندارد

۲۲۔ حالی، الطاف حسین — حیاتِ جاوید — آئینہ ادب۔ لاہور۔ ۱۹۶۶ء

۲۳۔ حسن ریاض — پاکستان ناگزیر تھا — ادارہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی ۱۹۶۸ء

۲۴۔ حسین احمد مدنی، مولانا — نقشِ حیات — دیوبند ۱۹۵۴ء

۲۵۔ حمید احمد خان — اقبال کی شاعری اور شخصیت — بزم اقبال لاہور۔ ۱۹۷۴ء

۲۶۔ خورشید مصطفےٰ رضوی — حیات ذاکر حسین — مکتبہ برہان دہلی ۱۹۶۹ء

۲۷۔ رئیس احمد جعفری — سیرت محمد علی — لاہور۔ ۱۹۵۰ء

۲۸۔ رئیس احمد جعفری — مطائبات محمد علی — حیدرآباد۔ ۱۹۴۵ء

۲۹۔ سید احمد خان — مقالات سرسید — مجلس ترقی ادب لاہور۔ ۱۹۶۲ء

۳۰۔ شمس تبریز خان — صدر یار جنگ — ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۹۷۲

۳۱۔ صدیق علی خان، نواب — بے تیغ سپاہی — الائیڈ بک کارپوریشن۔ کراچی ۱۹۷۱ء

۳۲۔ ظفر علی خان — چمنستان — مکتبہ کارواں لاہور [illegible]

۳۳۔ عاشق حسین بٹالوی — چند یادیں چند تاثرات — آئینہ ادب لاہور ۱۹۶۹ء

۳۴۔ عاشق حسین بٹالوی — ہماری قومی جدوجہد — البیان لاہور ۱۹۶۶ء

۳۵۔ عبدالرحمٰن، منشی — تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی — شیخ اکیڈمی لاہور ۱۹۷۵ء

۳۶۔ عبدالرحمٰن منشی — سیرتِ اشرف — نشر المعارف۔ ملتان ۱۹۵۶ء

۳۷۔ عبدالغفار، قاضی — حیاتِ اجمل — علی گڑھ۔ ۱۹۵۰ء

۳۸۔ عبدالماجد دریابادی — حکیم الامت — ایم شمس الدین لاہور ۱۹[illegible]ء

۳۹۔ عبدالماجد دریابادی — محمد علی کی ذاتی ڈ[illegible]ے چند اوراق — دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹ء

۴۰۔ عبیداللہ — مقالات یوم شبلی — اُردو مرکز لاہور ۱۹۶۱ء

۴۱۔ فرمان فتح پوری — ہندی اُردو تنازعہ — وزارتِ تعلیم اسلام آباد ۱۹۷۶ء

۴۲۔ مجذوب، خواجہ عزیز الحسن — اشرف السوانح — ایم ثناء اللہ لاہور ۱۳۷۷، ۱۳۷۸ھ

۴۳۔ مجذوب، خواجہ عزیز الحسن — حسن العزیز

۴۴۔ مجذوب، خواجہ عزیز الحسن — خاتمہ السوانح — ایم ثناء اللہ لاہور ۱۹۶۳ء

۴۵۔ محمد حسن، منشی — الکلام الحسن — تھانہ بھون ۱۹۶۵ء

۴۶۔ محمد سرور — افادات و ملفوظات عبیداللہ سندھی — سندھ ساگر اکادمی لاہور ۱۹۷۲ء

۴۷۔ محمد شفیع، مفتی — افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ — دیوبند ۱۳۶۵ھ

۴۸۔ محمد شفیع مفتی — مجالسِ حکیم الامت — دارالاشاعت کراچی ۱۹۷۴ء

۴۹۔ محمد عیسیٰ قاضی — کمالاتِ اشرفیہ — الہ آباد ۱۳۵۳ھ

۵۰۔ محمد یوسف — حسن العزیز — جلد دوئم

۵۱۔ مشتاق حسین — مکاتیب سر سید احمد خان — لاہور۔ تاریخ ندارد

۵۲۔ مہر، غلام رسول — تبرکات آزاد — کتاب منزل لاہور۔ سن ندارد

۵۳۔ نجم الدین اصلاحی — مکتوبات شیخ الاسلام — اُردو بک سٹال لاہور۔ سن ندارد

۵۴۔ نجم الدین اصلاحی — مکتوبات شیخ الاسلام جلد دوئم — مکتبہ دینیہ دیوبند سن ندارد

۵۵۔ نجم الدین اصلاحی — مکتوبات شیخ الاسلام جلد سوئم — مکتبہ دینیہ دیوبند۔ ۱۹۵۹ء

۵۶۔ نجم الدین اصلاحی — مکتوبات شیخ الاسلام جلد چہارم — مکتبہ دینیہ دیوبند۔ ۱۹۶۳ء

۵۷۔ نذیر نیازی، سید — اقبال کے حضور — اقبال اکادمی کراچی۔ ۱۹۷۱ء

اخبارات و رسائل

روزنامہ — انقلاب — لاہور

روزنامہ — پیسہ اخبار — لاہور

روزنامہ — عصرِ جدید — کلکتہ

علم و آگہی — قائد اعظم نمبر — ۱۹۷۶ء

اشاریہ

JAHD-O-JEHAD-E-AZADI AUR MAULANA ASHRAF ALI THANVI by PROF. AHMED SAYEED. 170 Pages. Rs. 1.50.

طوبیٰ لائبریری

راولپنڈی

اردو انگلش کتب اسلامی

تاریخی سفرنامے لغات